نفسیاتی نشو و نما کے مختلف مدارج میں

اسلامی آداب و معمولات

از

پروفیسر ڈاکٹر محمد فائق صدیقی قادری بدایونی

ناشر

شکیب پبلیکیشنز۔ کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نفسیاتی نشو و نما کے مختلف مدارج

میں

اِسلامی آداب و معمولات

از

پروفیسر ڈاکٹر محمد فائق صدیقی قادری بدایونی

بی۔اے (آنرز)، ایم۔اے، ڈی۔ایچ۔ایم۔ایس

(آر۔ایچ۔ایم۔پی)

ناشر

شکیب پبلیکیشنز۔ کراچی

حق اشاعت عام ہے

کتاب	نفسیاتی نشو ونما کے مختلف مدارج میں **اسلامی آداب و معمولات**
مصنف	پروفیسر ڈاکٹر محمد فائق صدیقی قادری بدایونی
کمپوزنگ	جیلانی پرنٹ انٹرپرائز:
اشاعت اول	سنہ ۲۰۱۱ء
طباعت	
تعداد	ایک ہزار
پروف ریڈنگ	ڈاکٹر مجیب عالم
قیمت	ایک سو پچاس روپیہ

ناشر

شکیب پبلیکیشنز ۔ کراچی

سی ۸/۱۱، فیڈرل بی ۔ ایریا ۔ کراچی

فون نمبر: 36365255-36367440

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلفَقرُ فَخرِیْ وَالْفَقْرُ مِنّیْ

فقر میرا فخر ہے اور فقر مجھ سے ہے

(رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم)

اَنَا عَبْدُہٗ وَلَیْسَ لِلْعَبْدِ مَعَ سَیِّدِہٖ اِخْتِیَارٌ وَّ لَااِرَادَہ

میں اس کا بندہ ہوں اور بندے کو اپنے مالک کے
آگے نہ کوئی اختیار رہے نہ ارادہ

(حضرت غوث پاک رحمۃ اللہ علیہ)

میرا ماہی صلّی علیٰ، مَیں کچھ بھی نہیں

(حضرت ابّا جی رحمۃ اللہ علیہ)

فہرست مشتملات

☆	انتساب	بنام روفی بھائی رحمۃ اللہ علیہ	۵
☆	پیش لفظ	مصنف	۷
☆	باب اول	آغاز و طفلی کے اسلامی آداب و معمولات	۹
☆	باب دوم	نوعمری کے اسلامی آداب و معمولات	۴۳
☆	باب سوم	بلوغ کے اسلامی آداب و معمولات	۶۵
☆	باب چہارم	اسلام اور فرد کا معاشی کردار	۱۰۷
☆	باب پنجم	تین نفسیاتی مسائل اور اسلام	۱۲۵
☆	باب ششم	واللہ اعلم بالصّواب	۱۴۵

انتساب

مرحوم چودھری عبدالرؤف قادری رحمۃ اللہ علیہ

(روفی بھائی) کے نام

(محمد فائق)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تبصرہ

ڈاکٹر مرزا نعیم الدّین

اس کتاب کا مطالعہ بغور کیا۔ آپ نے دینی باتوں کو دنیوی معاشرتی انداز میں اس طرح ڈھالا ہے کہ دینی باتوں کا سمجھنا بڑا ہی آسان ہوگیا ہے۔ آپ نفسیات کے پروفیسر ہیں آپ نے دینی امور کو نفسیاتی لحاظ سے تشریح و توضیح کر کے بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ کوئی بھی بڑے سے بڑا دینی عالم دین کو اس طرح نہیں سمجھا سکتا۔ آپ نے دین کا عملی پہلو اچھی طرح بیان کیا ہے معاشرتی رسم و رواج میں بڑی اصلاحی باتیں لکھی ہیں جو معاشرہ میں نظر انداز کی جا رہی ہیں۔

یہ کتاب دینی، معاشرتی، اخلاقی اعتبار سے بڑی اصلاحی کتاب ہے اس کو ضرور شائع ہونا چاہیئے۔

ڈاکٹر مرزا نعیم الدّین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

آج ۱۴۳۱ھ ہجری شعبانِ معظم کی ۲۱ رتاریخ ہے۔ آج کے دن میں زندگی کی ساتھ دہائیاں اور سات اکائیاں (۷۷) مکمل کر چکا ہوں آٹھویں دہائی کی آٹھویں اکائی (۷۸) میں قدم رکھ رہا ہوں۔۔۔ پیچھے ایک افسانہ ہے اور آگے ایک خواب...... خواب مختصر ہے اور افسانہ طویل۔ دونوں کا نقطۂ اتصال حال ہے جو بحمد اللہ اچھا گذر رہا ہے۔ نہ بینک بیلنیس ہے نہ کوئی جائیداد۔ نہ دولت کی آرزو ہے نہ ضرورت...... نہ موت کا خوف ہے نہ آرزو...... ہاں ایک خیال ہر وقت حاوی رہتا ہے۔ ''میرا رب مجھ سے راضی ہو جائے'' اس دعا کی قبولیت کے لیئے اسی ذات صلی اللہ علیہ وسلم کو وسیلہ بنایا ہے جسے میرے رب نے اپنا پیغام ہم تک پہنچانے کے لیئے وسیلہ بنایا تھا اور جس نے عقیدۂ آخرت کی صداقت کو میرے سینہ میں اتار دیا ہے۔

بحمد اللہ بیوی بقید حیات ہیں زندگی کی کامیابی و ناکامی کے تذبذب میں وقت گذار رہی ہیں۔ پہلا احساس اولاد کے حوالے سے دوسرا میرے حوالے سے ہے۔ بحمد اللہ تینوں بیٹے، دو بیٹیاں سب گھر والے اولاد والے برسر روزگار تعلیم یافتہ ہیں۔ تین بیٹے بیرون ملک اور دونوں بیٹیاں کراچی میں ہیں سب میرے حساب سے صحیح العقیدہ ہیں نسلاً صدیقی ہیں مسلک قادری ہے۔

نفسیات اور تعلیم میرے پیشہ وارانہ مضمون رہے ہیں مذہب اور ادب کا مطالعہ خاندانی ورثہ ہے۔ تدریس پیشہ رہا ہے۔ ۹ سال لیکچرار، ۹ سال اسسٹنٹ پروفیسر۔ ایک سال ایسوسی ایٹ پروفیسر اور ۲۰ سال پروفیسر رہا ہوں ۳۹ سال کے تدریسی تجربہ کے ساتھ چھوٹی بڑی ۵۱ کتب کا مصنف ہوں ان میں نصاب پر ۱۳،

مذہب وادب وتصوف پر ۸ اور ہومیو پیتھی پر ۳۰ کتب ہیں...... ہومیو پیتھی پر آخری کوشش ''ہومیو ڈکشنری'' ہے جو ہومیو پیتھی کی پہلی اور میری آخری کتاب ہے۔ اس کی تحریر میں تین سال کے اندر بوڑھا ہو گیا جبکہ ۴۷ سال لکھنے پڑھنے کے لیئے جوان رہا۔

بحمداللہ جدوجہد اور خدمت سے بھرپور محنتِ شاقہ کی کامیاب زندگی گذارنے کے بعد اب گردوپیش پر نظر ڈالتا ہوں تو ہر طرف لوٹ مار قتل وغارت ہے...... لوگوں کو پیسہ کمانے کے علاوہ کوئی سبق یاد نہیں۔ تمام اچھی قدریں عمل سے تو پہلے ہی دور تھیں اب ذہنوں سے بھی دور ہو رہی ہیں۔ ہر طرف طلب دنیا ہے۔ دنیا بھی خیر والی نہیں۔ ''شیطانی''!

کوئی ایسا اصلاحی ادارہ یا تحریک نہیں جو ہمیں اقدار و اخلاقِ دین کی طرف مائل کرے، ٹی۔ وی، پر خیر کا درس دینے والوں کی آواز میں تاثیر نہیں۔ والدین کو اولاد کی تربیت کا نہ ہوش نہ استعدا...... اساتذہ ٹیوشن پڑھانے اور پیسہ کمانے میں مصروف مدارس صرف تکمیل نصاب تک محدود...... علماء سیاست میں ملوث اور سیاست داں جائز وناجائز سے بالاتر ''سرمایہ کاری اور زرداری کا شکار''...... میرے اللہ میں کیا کروں؟

قلم کی رفتار ہر چند سست اور سوچ مضمحل ہو چکی ہے پھر بھی قلم اٹھایا کہ ہم ''اسلامی آداب ومعمولات'' کا جو سرمایہ اپنی زندگی سے تو کھو بیٹھے لاؤ کتاب کی شکل میں ہی محفوظ کرلوں۔ زیر نظر کتاب اسی سوچ کا مظہر ہے کہ اس میں کوشش کی گئی ہے کہ نشوونما کے مختلف نفسیاتی مدارج میں جو اسلامی آداب ومعمولات رائج رہے ہیں اور جنھیں لوگ بھولتے جا رہے ہیں مختصراً قلم بند کردوں!

شاید کوئی بندۂ خدا آئے
صحرا میں اذان دے رہا ہوں

پہلا باب

آغاز و طفلی کے اداب و معمولات

ابتدائیہ......مباشرت......حمل......اسقاط......ولادت......
ولادت اور اذان...... بچہ کا نام اور عقیقہ......نفاس و زچگی......
رضاعت......ختنہ......بسم اللہ خوانی......علم قران......نشرہ......
قران کی انفرادیت......تفہیم قران...... چند دیگر پہلو......علم اور
زبان...... آداب خورد و نوش...... صفائی اور طہارت......لباس
اور پوشاک......سونا جاگنا......سلام......مدرسہ اور اساتذہ۔

ابتدائیہ

اگر انسانی زندگی کا سرسری جائزہ لیا جائے تو زندگی دو ادوار میں بٹی ہوئی نظر آتی ہے ان میں پہلا دور بلوغ سے پہلے کا اور دوسرا دور بلوغ یا بعد کا ہے۔ قانونی اخلاقی اور سماجی ہر لحاظ سے قبل از بلوغ دور میں فرد کی ذمہ داریاں کم اور حقوق زیادہ ہوتے ہیں یہ اس کے سیکھنے اور شخصیت کی تعمیر کا دور ہے فرد کا بچپن ہی اس کے بلوغ کا تعین کرنے والا ہے اس لیئے کہا جاتا ہے "Child is the fatehr of man" یعنی بچپن بلوغ کو جنم دیتا ہے۔ اسی دور میں شخصیت کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔

نفسیاتی لحاظ سے شخصیت کا تعین کرنے والے بعض عوامل وراثتی ہوتے ہیں اور بعض سماجی ان دونوں عوامل کا خصوصی تعلق والدین سے ہے۔ وارثتی عوامل تو ''کُلیتاً'' والدین سے حاصل شدہ ہوتے ہیں اور سماجی عوامل بھی ابتداً زیادہ تر والدین سے ہی متعلق ہوتے ہیں۔ چنانچہ فرد کے کردار و شخصیت کا تعین کرنے میں اہم ترین ذمہ داری والدین کی ہی ہے۔

والدین سے حاصل شدہ موروثی عوامل کا فیصلہ یا تعین تو استقرارِ حمل کے وقت ہی ہو جاتا ہے۔ ایک نر اور دوسرا مادہ خلیہ یعنی ایک اسپر ماٹوزون (مردانہ جنسی خلیہ) اور ایک بیضۃ Ovum (نسوانی جنسی خلیہ) جب بذریعہ مباشرت باہم ملتے ہیں تو حمل قائم ہوتا ہے، یعنی نئے فرد کی نشو ونما کی بنیاد رکھی جاتی ہے اسپر ماٹوزون کے ۲۳ کرومیوں اور بیضہ کے ۲۳ کرومیوں سے ملکر یعنی دو جنسی

خلیوں سے ایک ''جسمی خلیہ'' جو کرومیوں کے ۲۳ جوڑوں یعنی ۴۶ کرومیوں پر مشتمل ہوتا ہے، وجود میں آتا ہے جسے جکتہ (zygot) کہتے ہیں والدین سے جو کچھ بطور وراثت میں ملتا ہے وہ ان ۴۶ کرومیوں کے ذریعہ ہی ملتا ہے اس کے بعد فرد کو ماں کے شکم میں یا بعد پیدائش جو کچھ بھی ملتا ہے وہ سب ماحول کے عوامل ہیں یعنی **۲۳ مردانہ کرومیئے + ۲۳ نسوانی کرومیئے + اندرونِ شکم ماحول + بعد ولادت خارجی ماحول = شخصیت** ...... یعنی وراثتی عوامل نیز اندرونِ شکمِ مادر بچہ کو حاصل ہونے والے بعض طبّی ونفسیاتی میلانات اور بعداز پیدائش خارجی ماحول کے بہت سے عوامل ملکر بچہ کی شخصیت کا تعین کرتے ہیں۔ ان تینوں مدارج کے اکثر عوامل والدین سے ہی متعلق ہیں اسی لیئے یہ کہنا درست ہے کہ بچہ والدین کی پرورش و پرداخت کا آئینہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اخلاقی حوالے سے بچہ کی شخصیت کا تعین کرنے والوں میں سب سے زیادہ ذمہ داری والدین پر عائد ہوتی ہے۔

اسلام وہ واحد دین ہے جس نے اعتقادی مسائل کے علاوہ دیگر اقدارِ زندگی کا تعین کرتے ہوئے پرورشِ اولاد کے لیئے واضح اصول و ہدایت مرتب کی ہیں۔ ان اقدار سے ہی ماخوذ پرورش اطفال کے لیئے والدین کی ذمہ داریوں کا ایک جائزہ حسب مدارج نشو ونما ذیل میں پیش کیا جارہا ہے۔ اگر ان چھوٹی چھوٹی اور بظاہر معمولی نظر آنے والی ذمہ داریوں کو والدین ملحوظ رکھیں تو یقیناً ان کی اولاد صالح ہوگی اور ان پر مشتمل معاشرہ ایک اعلیٰ معاشرہ ہوگا۔ درج ذیل عنوانات کے حوالے سے بیان کردہ آداب و معمولات کو ذہن نشین کیجیے۔

مباشرت

مباشرت مرد وزن کے جنسی اتصال کو کہتے ہیں یہ ایک پاکیزگی کا عمل ہے

جو ''زنا'' نہ ہو یعنی اس عورت کے ساتھ کیا جائے جو ''مرد کی مِلک ہو'' (منکوحہ یا کنیز خریدہ یا تحفہ میں دی گئی)۔آداب و معمولات کے حوالے سے اس عمل کو پہلا عنوان اس لیئے بنایا گیا ہے کہ اسی کے ذریعہ فرد کی تخلیق و پرورش کے عمل کا آغاز (حمل) ہوتا ہے۔ جہاں یہ عمل عضویاتی عوامل کی رو سے بچہ کی شخصیت اور وراثت کا تعین کرتا ہے اسی طرح اس عمل کے دیگر پہلو بھی سائنسی گرفت سے بالاتر بچہ کی خصلت وفطرت وشخصت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ والدین کی نیت اور ان کے حاوی جذبات بھی نفسیاتی عوامل کی حیثیت سے بچہ کی شخصیت کے تعین میں بالکل بے اثر نہیں ہیں۔ مثلاً زنا کے جرم کے احساس کے زیر اثر پیدا ہونے والا بچہ ''ولد الزّنا'' حرامی کہلاتا ہے۔ مگر احساسِ گناہ کے بغیر کافر والدین کا بچہ بھی معصوم ہوتا ہے۔ نیز یہ کہ فطرت نے اس عمل کو محض حصولِ لذّت کا ذریعہ نہیں بنایا ہے بلکہ اس کی مقصدیت نسلِ انسانی کی پرورش و پرداخت ہے۔ اگر محض حصول لذّت ہی مقصود فطرت ہوتا تو جَلق کو مکروہ اور اغلام و زنا کو حرام نہ کیا جاتا۔ حاصل یہ کہ اچھے خصائل کے حامل پاک طینت بچہ کی تخلیق کے لیئے والدین کو عمل مباشرت میں درج ذیل آداب کو ملحوظ رکھنا چاہیئے۔

۱۔ بوقت مجامعت والدین کا ذہن وجسم پاک ہونا چاہیئے۔

۲۔ نیت محض حصول لذت نہ ہو بلکہ کار تخلیق میں فطرت کی معاونت ہونی چاہیئے۔

۳۔ اس عمل کی انجام دہی میں طرفین کی آمادگی ہونی چاہیئے۔

۴۔ حالت جنابت میں حتی الامکان کھانے پینے سے گریز اور غسلِ طہارت میں عجلت کرنی چاہیئے۔

۶۔ دورانِ حیض مجامعت ممنوع ہے اس کے نفسیاتی اور طبی مضمرات بھی منفی ہیں۔

۷۔ دیگر نیک کاموں کی طرح اس عمل کے ارادے کے ساتھ بسم اللہ کرنی چاہیئے۔

حمل

اسلامی اخلاقیات میں مباشرت کا مقصد تولید ہے چنانچہ جب حمل کی تصدیق ہوجائے تو اولاد کے صالح اور صحت مند ہونے کی دعا کے ساتھ شکر ادا کرنا چاہیئے۔ معروف طریقہ میں تو استقرارِ حمل کی پہچان حیض کا بند ہوجانا ہے مگر جدید طبّی آزمائشوں کے ذریعہ بالکل ابتدائی ایام میں بھی استقرارِ حمل کی تصدیق ہوجاتی ہے اور تھوڑی مدت کے بعد ہی بچہ کی جنس کی بھی تصدیق ہوجاتی ہے جسے تسلیم کرنے میں کوئی شرعی یا اخلاقی قباحت نہیں ہے۔ استقرارِ حمل کی تصدیق پر شکر و دعا کے ساتھ بعض طبّی احتیاطیں بھی لازم ہیں جن میں مجامعت کا امتناع شامل نہیں ہے بلکہ اس دور میں مجامعت کھیتی کو پانی دینے کے مترادف ہے البتہ کوئی ایسی وضع جسم اختیار کرنا جس سے رحم کا منہ کھلنے کا خطرہ ہو منع ہے۔ کوئی وزن اٹھانا یا ذہنی وجسمانی دباؤ موجب اسقاط ہوسکتا ہے۔

اسقاطِ حمل

اسقاطِ حمل کے معنی حمل ضائع ہونے، ساقط ہونے یا گر جانے کے ہیں، ارادی طور سے اسقاط کرانا کسی ''طبّی عذر'' کے بغیر ممنوع ہے۔ اسقاطِ حمل کی ابتدائی علامت خون جاری ہونا ہے بالعموم بغیر درد کے اور رحم کے منہ کھلے بغیر مگر جب اجرائے خون کے ساتھ ولادت جیسے درد ہوں اور رحم کا منہ کھل گیا ہو تو یہ (Inevitable Abortion) ناگزیر اسقاط ہے اس شکل میں طبّی مشاورت پر

صفائی کرنا ممنوع نہیں بلکہ مستحب ہے۔ ہومیو دواؤں میں اس عمل کے لیئے مناسب دوا Sabina ہے اور اگر رحم کا منہ نہیں کھلا ہے اور درد شدید نہیں ہیں صرف خون جاری ہوا ہے تو اس کی بہترین دوا Trillium. Pend ہے جو خون روک کر صحت مند حالت واپس لا سکتی ہے۔ چمکدار سرخ خون متلی کے ساتھ ہو تو Ipecac اور سیا خون کے لیئے Secale اہم ہیں اور اسقاط ہونے کے بعد زیادہ خون ضائع ہونے کی کمزوری کے لیئے China اور Carbo-Veg اہم ہیں۔ مروجہ طریق صفائی D and C ہے جس کے بعد حمل قائم ہونے کے امکانات کم ہو جانا غلط تصور ہے۔

اسقاط کا ایک اہم پہلو جنین (Foetus) کی عمر ہے ابتدائی ایام بالعموم تیسرے مہینہ میں یہ شکایت عام ہوتی ہے اس وقت تک جب بچہ انسانی شکل اختیار نہ کرلے اسے اخراج کے بعد ضائع یا دفن کر دینا کافی ہے۔ اگر اعضاء مکمل انسانی شکل میں ہوں تو تکفین و تدفین دونوں ضروری ہیں اگر ولادت کے وقت یا بعد بچہ نے سانس لی ہے یا آواز نکالی ہے تو نماز جنازہ بھی واجب ہے۔

ولادت

بچہ کی صحت مند ولادت بالعموم استقرار حمل کے تقریباً ۳۶ ہفتہ یا ۲۵۲ یوم گذرنے کے بعد ہوتی ہے۔ فی زمانہ حاملہ کسی ماہر نسوانیات ڈاکٹر کے زیر معائنہ رہتی ہے۔ اور وہ آزمائشوں کے ذریعہ وقتِ ولادت کی تقریباً صحیح نشاندہی کر دیتی ہے۔ ولادت کی ابتدائی علامت دردزہ اور اجرائے خون ہے ان علامات کے ظاہر ہوتے ہی ولادت کے جملہ انتظامات حسب مقدور کرنے چاہئیں۔ بالعموم پہلی ولادت کا عمل پہلی مجامعت کی طرح زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے چنانچہ ترقی یافتہ مالدار اور متمول خاندان میں تو دردزہ سے بچنے کے لیئے خواتین

شکم چاک کروا کے غیر فطری طریقے سے بچہ باہر نکلوالتی ہیں۔ چونکہ ''جولیس سیزر'' کے دادا سیزر کی ولادت بھی اسی طرح ہوئی کہ اسے مردہ ماں کا پیٹ تلوار سے چاک کر کے زندہ نکال لیا گیا تھا اسی نسبت سے شکم چاک کر کے نکالے جانے والی بچوں کو ''سزیرین'' کہتے ہیں۔ مجبوری کی بات جدا ہے ورنہ یہ طریقہ فطرت سے انحراف ہے اس طریق ولادت کے منفی اثرات مابعد کی ابھی تک سائنسی تحقیق نہیں ہوئی ہے۔ مگر اس بات پر اکثر ماہرین متفق ہیں کہ نارمل ولادت کے عمل میں باہر آنے کے لیئے بچہ کو جو عضلاتی مشقت کرنی پڑتی ہے۔ اس کے مثبت عضویاتی اور نفسیاتی مابعد اثر سے بچہ محروم رہتا ہے۔ ماؤں کو حمل سے لے کر وضع حمل تک کی جو تکالیف برداشت کرنی پڑتی ہیں بشمول رضاعت و پرورش ان کے عوض قدرت نے ماں کے جو حقوق رکھے ہیں ان کا استحقاق کمزور ہو جاتا ہے جو آئندہ سماجی زندگی کے معاملات پر اثر انداز ہوسکتا ہے۔ پھر یہ کہ ''ابنارمل'' طریقہ سے پیدا شدہ بچہ کیا نارمل ولادت والے بچے جیسا ''ماں کو شعوری اور لاشعوری ہر دو لحاظ سے'' ہوسکتا ہے ابھی یہ امر غیر تحقیق شدہ ہے۔ ویسے بہتر اور افضل بات ''حیوانی فطری طریقہ سے ہی ولادت پسندیدہ عمل ہے'' بشرطیکہ کوئی طبّی عذر مانع نہ ہو۔

ولادت اور اذان

مہذب اسلامی خاندانوں کی ایک صحت مند اور پر مصلحت روایت نوزائیدہ بچہ کو غسل کروانے کے بعد اس کے دونوں کانوں میں اذان دلوانا ہے۔ حدیث شریف کے مطابق سیدھے کان میں اذان اور الٹے کان میں اقامت کہی جائے۔ اس کی برکات بچہ کے پورے مستقبل اور زندگی کا احاطہ کرتی ہیں۔ اس اذان سے ایک تصور یہ بھی ملتا ہے کہ فرد کی زندگی ''اذان اور نماز'' کا درمیانی وقفہ ہے۔ بعد ولادت اذان دی جاتی ہے اور بعد وفات نماز ہوتی ہے۔ مختلف عقیدتی نسبتوں

سے اذان کی تعداد کا تعین کیا جاتا ہے تین مرتبہ...... پانچ مرتبہ...... دس مرتبہ...... گیارہ یا چودہ مرتبہ...... تین دفعہ شرعی نسبت ہے۔...... پانچ مرتبہ پنجتن پاک کی نسبت...... دس عشرہ مبشرہ کی...... گیارہ غوث پاک کی اور چودہ معصومین کی نسبت ہے۔ یہ ایک اچھی روایت ہے اس سے بے توجہی اور اس کا ترک پسندیدہ عمل نہیں کہ اس سعادت سے محروم بچوں پر شیطانی غلبے کے زیادہ امکانات ہیں۔

بچہ کا نام اور عقیقہ

عقیقہ وہ مثبت اور مستحکم رسم ہے جو قدیم سے چلی آرہی ہے۔ اس رسم کے تین بنیادی اجزاء ہیں

۱۔ بکرے کا ذبیحہ اور ضیافت
۲۔ بچہ کے سر کے بال منڈوانا
۳۔ بچہ کا نام رکھنا

یہ رسم ولادت کے ایک ہفتہ کے اندر انجام دینا چاہیئے اگر ولادت بیٹے کی ہے تو دو (۲) بکرے اور لڑکی کی ہے تو ایک اللہ کے نام پر دفع بلیات وصدقہ کے طور پر ذبح کر کے مستحقین واقارب میں تقسیم کیا جاتا ہے یا اسے پکا کر ضیافت کا انتظام کیا جاتا ہے۔

اس سے قبل بچہ کے سر کے بال منڈوائے جاتے ہیں اور نبی کریم ﷺ کی ہدایت کے مطابق بال اتروانے کے بعد پانی میں حل شدہ زعفران سر پر مَلا جائے یہ خبث و خبائث (جرثوماجات) سے نجات اور صفائی کا ایک عمل ہے۔ یہ پختہ روایت ہے کہ بچہ کے پیدائشی سر کے بالوں کے ہم وزن چاندی خیرات کی جاتی ہے۔ یہ عمل صدقہ و خیرات اور کھانا کھلانے کے اصولِ اخلاق کا نقطہ آغاز ہے جو اللہ کے نام پر نومولود کی دائمی خیر و عافیت کے لیئے کیا جاتا ہے۔

اس رسم کا تیسرا اہم عنصر بچہ کے نام کا اعلان کرنا ہے بعض گھرانوں میں بوقت ذبحہ بکرے کے کان میں بچہ کا نام لیا جاتا ہے اسلام میں نام رکھنے کی بڑی اہمیت ہے کہ "جو پیدا ہوا وہ مرے گا" اور جو مرے گا وہ دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور حشر میں نام لے کر ماں کے حوالے سے پکارا جائے گا حشر میں باپ کے بجائے ماں کے نام سے پکارے جانے کا رمز ماں (بکے عیب یا گناہ) کی پردہ داری ہے۔

نام رکھنے میں اپنے اسلاف اور بزرگان دین کے نام دوھرانا افضل ہے۔ جدید مہمل اور نامانوس نام رکھنے سے بچہ بزرگوں کے نام کی برکت اور فیض سے محروم ہو جاتا ہے سرکار صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے میرا نام رکھو۔ مگر کنیت نہیں۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا پسندیدہ نام "عبداللہ" ہے راقم کے گھرانے میں اکثر مردانے ناموں کا پہلا ٹکڑا "محمد" اور اکثر نام صحابہ، تابعین اور تبع تابعین و بزرگان دین کے ہیں (بحمداللہ راقم کے تین بیٹے محمد اویس۔ محمد بلال اور محمد زید ہیں اللہ انہیں سلامت رکھے) نسوانی ناموں میں بھی بزرگ خواتین کے نام خدیجہ۔ عائشہ، سلمٰی، فاطمہ، رقیہ، کلثوم، ہاجرہ اور سارا بابرکت ہیں۔ راقم کی نظر میں نامانوس، کم یاب اور بے تکے نام رکھنے کا میلان مناسب نہیں اسی طرح بعض غلط نام بوجہ لاعلمی غلط رائج ہو گئے ہیں مثلاً "ثَوَیبہ کی جگہ ثوبیہ"!

نفاس و زچگی

نفاس اس خون کو کہتے ہیں جو بچہ کی ولادت کے بعد بچہ دانی سے زیادہ سے زیادہ چالیس دن تک کم و بیش خارج ہوتا رہتا ہے ان ایام نفاس کو ہی زچگی کہتے ہیں۔ اس مدت میں مجامعت قطعاً ممنوع ہے حکم شرعیہ کے علاوہ اس کے طبّی مضمرات بھی ہیں نسوانی جسم کی مختلف جنسی حالتوں میں حیض و حمل و زچگی و

رضاعت کے دوران جسم کے انڈوکرائن غدود سے خارج ہونے والے ہارمونز کی مقدار و تناسب مختلف اور جاری صورت حال کے مطابق ہوتا ہے بچے کی ولادت کے بعد چالیس دن تک نفاس کا جاری رہنا اس لیئے ضروری ہے کہ اس کے ذریعہ یوٹرس کی صفائی ہوتی رہتی ہے جو آئندہ صحت مند ولادت کے لیئے ضروری ہے۔
اس مدت میں مجامعت سختی سے منع ہے اس کی دو مصلحتیں ہیں ایک تو یہ کہ دوران نفاس وزچگی ہارمونز کی اخراجی فعلیّت مباشرت سے موافقت نہیں رکھتی دوم یہ کہ اس دور میں مجامعت سے فطرت کا مقصد حاصل نہیں ہوتا کہ حمل کے امکامات مفقود اور ذہنی نفسیاتی اور دیگر طبّی عارضوں کے امکانات نہایت واضح رہتے ہیں۔
نفاس کے بعد حیض واحتلام ومباشرت کی طرح غسل لازم ہے۔

رضاعت

رضاعت کے معنی ماں کا بچہ کو دودھ پلانا ہے۔ اسلامی اخلاقی قدروں کے مطابق پیدائش کے بعد سے دو سال کی عمر تک بچہ کو دودھ پلانا مناسب بلکہ ضروری ہے۔ اس کے طبّی اور نفسیاتی مضمرات بہت ہیں یہ دوھری افادیت کا فطری عمل ہے جو ماں اور بچے دونوں کے لیئے انتہائی مفید ہے اور بغیر طبّی جواز اس پر عمل پیرا نہ ہونے میں طرفین کے لیئے نقصانات ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ سائنسی لحاظ سے ماں کے دودھ میں وہ تمام غذائی عناصر بہترین تناسب سے پائے جاتے ہیں جو بچے کی جسمانی نشو ونما کے لیئے نہایت ضروری اور مفید ہیں بلکہ ماں کا دودھ پینے سے بچہ کی جبلتوں کی تسکین ہوتی ہے ماں کے آغوش اور پستانوں کی گرمی اور لمس بچہ کے ہونٹوں کے ذریعہ جو اسے نفسیاتی تسکین فراہم کرتے ہیں اس سے محرومی جدید نفسیاتی تحقیق ونظریاث کی رو سے زبردست شکست ومحرومی اور نفسیاتی شکست خوردگی وعدم تسکین کا سبب بن کر لاشعوری طور سے ایسے مضر اثرات مرتب

کرتی ہے جو ذہنی و جسمانی صحت کے لیئے نہایت مضر ہیں۔ ہونٹوں کے لمس کے علاوہ اس حوالے سے آغوش مادر کی حرارت و راحت بھی بچہ کے لیئے نہایت مفید ہے جو بوتل سے حاصل نہیں ہوتی۔ نیز یہ کہ بچہ کو باقاعدگی سے دودھ پلاتے رہنے سے ماں کے ان ''ہارمونز'' کا اخراج بھی نارمل رہتا ہے جو زچگی کے دور کا تقاضہ ہے۔

شیر خواری کے عمل میں بچہ کے دونوں ہاتھ ماں کے پستان پر رہتے ہیں اور بچے کے ہاتھوں اور انگلیوں میں ایسی جنبش ہوتی رہتی ہے جس سے ماں کے پستانوں میں دودھ اترتا رہتا ہے ایسی جنبش سے ہر دودھ دینے والے حیوان میں بھی اخراج تیز ہوتا ہے جس سے پستانی نالیوں کی صفائی متعدد پستانی عوارض سے نجات کا سبب بنتی ہے۔

یہاں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ رضاعت محض ایک عضویاتی عمل ہی نہیں بلکہ ایک فطری اور نفسیاتی رویہ ہے جس کی صحت مندانہ بجا آوری بچے کی ذہنی صحت کے لیئے بھی ضروری ہے۔ دوران رضاعت بچہ کو جھڑکنا۔ ڈانٹ پھٹکار کر پٹخنا اور کرختگی سے پستان منہ سے کھینچ لینا بچہ میں ناپسندیدہ ردعمل پیدا کرتا ہے اسی لیئے اسلامی اخلاق و اقدار ماں کے مثبت رویہ کو سراہتے ہوئے ماں کے ''دودھ کے حق'' کو اہمیت دیتے ہیں۔ ''زیر قدم والدہ فردوسِ بریں ہے''...... ایسی مائیں جو نہ تو دردزہ سے گزرتی ہیں اور نہ رضاعت کی تکلیف برداشت کرتی اور جن کے بچے ''معصوم نرسری'' میں پرورش پاتے ہیں صرف دوران حمل ہی ''نو ماہ کا بوجھ برداشت کرنے کے سبب ہی'' اولاد پر بڑا حق رکھتی ہیں۔

اگر بعض طبّی مجبوریوں یا دوسرا حمل جلد قائم ہو جانے کے سبب ماں رضاعت کی

دوسال کی مدت پوری نہ کر سکے تو عام پاؤڈر کے دودھ کے مقابلے میں ''گائے'' کا دودھ زیادہ مناسب ہے ہندو عقیدے والے اسی نسبت سے گائے کو ''گئو ماتا'' یعنی ماں کہتے ہیں جس کے بچھڑے اور بچھیوں کی انسان نے بڑی ''حق تلفی'' کی ہے۔

اگر کوئی ماں خرابی صحت کی بنیاد پر رضاعت کے عمل سے قاصر رہے تو تاریخ وروایت کی رو سے کسی دوسری عورت کا بچہ کو دودھ پلانا جائز ہے خواہ وہ معاوضہ کے ساتھ ہو یا بغیر معاوضہ۔ ایسی ''رضاعی ماں'' کے حقوق بھی بچہ پر عائد ہوتے ہیں اور وہ تمام لڑکے اور لڑکیاں جنھوں نے ''اِس ماں'' کا دودھ پیا ہے از روئے حقوق بہن بھائی کی ہی تعریف میں آتے ہیں رضاعی بہن بھائی بھی اسلامی اخلاق کی رو سے ''محرم'' ہیں۔

ختنہ

اگر اللہ تعالیٰ کسی کو بیٹا عطا فرمائے تو والدین کی ایک اضافی ذمہ داری یعنی مردانہ جنسی عضو کی حشفہ سے آگے لٹکتی ہوئی کھال (Prepuce) کٹوا دینا ضروری ہے اس عملِ جراحی کو ''ختنہ'' کہتے ہیں۔ یہ عمل مسنونہ ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ مختون پیدا ہوئے تھے۔ یہ عمل جنسی وطبّی ہر دو لحاظ سے انتہائی مفید ہے۔ ہومیو پیتھک ڈاکٹر جے۔ ٹی کینٹ نے اس کھال کی ۳۰ بیماریوں کا اپنی ریپرٹری میں حوالہ دیا ہے جن سے بذریعہ ختنہ نجات مل جاتی ہے۔ نیز عضو کی صفائی میں سہولت رہتی ہے۔ انفیکشن کے امکانات کم ہوتے ہیں اور پیشاب کی تلچھٹ کے ذرات نہیں رُکتے۔ یہ عمل اگر سرجن کے ذریعہ ابتدائی دنوں میں انجام دلوایا جائے تو بہتر ہے کہ اس عمر میں جراحتی پیچیدگیاں نہیں ہوتیں اور زخم جلد خشک ہو جاتا ہے۔ جبکہ عمر بڑھنے کے ساتھ تاخیر مفید نہیں ہے۔

بسم اللہ خوانی

اسلامی اخلاقیات میں بچہ کی تعلیم کے آغاز کی یہ با قاعدہ رسم اسلام کی انفرادیت ہے۔ میری معلومات کی حد تک دوسرے مذاہب یا غیر اسلامی معاشروں میں آغاز تعلیم کہیں اتنی باقاعدگی سے نہیں ہوتا جیسے ہمارے یہاں رائج ہے۔ بعض علاقوں میں رسم بسم اللہ خوانی اور اس کی تقریب کو ''مکتب'' بھی کہتے ہیں۔ اس تقریب میں مٹھائی خاص کر لڈوؤں کی تقسیم اور ضیافت خاص پہلو ہیں۔ اپنے علاقہ کا کوئی عالم بسم اللہ پڑھانے کا فریضہ انجام دیتا ہے اور برسر محفل بچہ بالعموم لڑکے کو سجا بنا کر بسم اللہ پڑھوائی جاتی ہے اور بالعموم بسم اللہ خوانی کے ساتھ یہ دعا کی جاتی ہے کہ ''ہمارے رب آسانیاں فراہم کر اور سختیوں سے بچا اور خیر سے اتمام کر''......سورۂ فاتحہ اور سورۂ علق کی ابتدائی آیتوں کی تلاوت بھی کی جاتی ہے اور بچہ کی تکمیل علم کے لیئے اجتماعی دعا بھی کی جاتی ہے۔

از روئے روایت اس رسم کی انجام دہی کے لیئے بچہ کی عمر چار سال چار ماہ اور چار دن مقرر ہے۔ یہ عمر سرکار کے واقعہ شق الصدر کی عمر سے مناسبت کے لیئے ہے۔ اس رسم کے حوالے سے بھی اس امر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرے میں علم و تعلیم کی اہمیت کس قدر زائد ہے۔''......حضرت آدم کو دیگر مخلوق پر شرف اسی بنیاد پر دیا گیا وجہ خلافت علم کو ہی قرار دیا اور اسی عظمت کے حوالے حضرت آدم مسجود ملائکہ ہوئے...... پھر یہ ورثہ انبیاء کو ملتا رہا اور نبی آخر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں علم کا شہر ہوں اور علی رضی اللہ عنہ اس کا دروازہ ہیں۔ اسی دروازہ سے فیض علم آج بھی جاری ہے جو پوری امت کو اور امت کے علماء اور اولیاء کو مل رہا ہے۔ اسی کے ساتھ جملہ مومنین و مومنات پر حصول علم کو اہم فریضہ قرار دیا ''علم

دینوی ہو یا دنیاوی علم علم ہے'' ہمارے اخلاقی نظام میں تعلیم کا باقاعدہ آغاز تعلیم القران سے ہوتا ہے۔

علم قران

بسم اللہ خوانی کے بعد ہر بچہ کو قران پاک پڑھایا جاتا ہے۔ بچہ کی مقامی مادری زبان کچھ بھی ہو مگر قران حکیم عربی میں ہی پڑھایا جاتا ہے اور اعجاز قران پاک یہ ہے کہ عالم و متعلم دونوں عربی زبان سے عدم وقفیت کے باوجود معنی سمجھے بغیر ہی قران پاک صحیح تلفظ کے ساتھ اور اکثر صحیح قراءت کے ساتھ روانی سے پڑھ لیتے ہیں اور بعض بچے تو کم عمری میں ہی اس کے حافظ ہو جاتے ہیں اور تا حیات اس کا ورد جاری رکھتے ہیں اعجاز قرانِ پاک یہ ہے کہ زیر و زبر کے فرق کے بغیر لاکھوں افراد زبان و مفہوم سمجھے بغیر اس کے حافظ ہیں اور ہر سال پورے عالم اسلام میں ماہِ رمضان میں تراویح کے ساتھ پورا کلام پاک با آواز بلند پڑھا اور سنایا جاتا ہے۔ بعض مساجد میں ایک رات میں ہی پورا قران پاک ختم کیا جاتا ہے اس کے علاوہ دیگر مبارک مواقع پر بھی ختم قران کا رواج ہے امت اور اولیاء و علمائے امت کے اس طریق میں تا قیامت تحفظ قران کا رمز موجود ہے پورے قران پاک کے علاوہ سورۂ فاتحہ اور بعض چھوٹی بڑی سورتیں اور قرانی دعائیں تو کسی نہ کسی حد تک ہر مسلمان کو حفظ ہیں یہ بات دنیا کی کسی دوسری تحریر میں موجود نہیں ہے حفظِ قران پاک کی یہ مبارک روایت زندہ رکھنے میں والدین کو کردار ادا کرتے رہنا ضروی ہے۔

نشرہ

تعلیم قران پاک اور مطالعہ کے حوالے سے ہماری ایک نہایت اہم رسم یا طریق ''نشرہ'' ہے بعض حضرات غلط فہمی کی بنیاد پر اس لفظ کی املا میں غلطی کرتے ہیں اور ''ہائے ہوّز'' کے بجائے ''حائے حطّی'' لکھتے ہیں۔ یہ دونوں الفاظ ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ جب بچہ قران حکیم مکمل کر لیتا ہے۔ اس کی خوشی میں جو تقریب منعقد کی جاتی ہے اس کو ''نشرہ'' کہتے ہیں اس کے لفظی معنی ''سرکلر'' یا اعلان کے ہیں۔ جب کوئی معلم بچہ کے ختم قران پاک کا اعلان کرتا ہے تو وہ نشرہ کہلاتا ہے ہمارے اکثر خاندانوں میں یہ رسم بڑی خوشی اور جوش و خروش سے انجام دی جاتی ہے۔ احباب و اعزاء و اقارب کی ضیافت کی جاتی ہے مٹھائی تقسیم ہوتی اور بعض خاندانی روایتوں کے مطابق بچہ کو دولہا کی طرح سجاتے ہیں جیسے بسمہ اللہ خوانی میں ہوتا ہے۔ راقم کو ان رسوم کی تاریخِ آغاز کا علم نہیں مگر یہ یقین ہے کہ دنیا کی دوسری خرافات سے بچ کر اگر آغاز قران و ختم قران کے حوالے سے یہ تقاریب منعقد کی جائیں تو یہ بدعت ہی سہی مگر ''بدعات حسنہ'' ہیں اس لیئے کہ اساسی اسلامی اقدار و اخلاق سے ہی ماخوذ ہیں۔ ایسی رسوم کو سراہنا چاہیئے کہ کسی عنوان بھی سہی جو کچھ کیا جاتا ہے اللہ کے نام پر ہے کسی غیر کی خوشنودی کے لیئے نہیں ہے۔

ایسی مبارک تقاریب و رسوم کا معاشرے میں رچ بس جانا ہماری اساسی اقدار، معتقدات اور اخلاق کو تقویت پہنچاتا ہے مگر یہاں دو باتیں ملحوظ رہنی چاہئیں اول یہ کہ افراد و معاشرہ ثانوی اخلاقی معمولات میں گم ہو کر اصل کو نہ بھول جائیں اور نہ ہی ان میں غلطاں رہنے کے سبب دنیاوی علوم کی تدریس و کسب

حلال سے لا پرواہو جائیں۔حصول دنیا کے لیئے اعتدال کی راہ اپنانی ضروری ہے اللہ ان والدین کو بھی ہدایت دے جو حصول دنیا کے لیئے اپنی اصل چھوڑ کر تعلیمی حوالے سے دینی تعلیم کے بجائے ''مونٹیوسری'' ''نرسری'' اور ''پریپ'' کی راہ لے کر بچہ کو قرانی تعلیم سے محروم کر دیتے ہیں۔

یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ دینی عقائد، مذہبی تعلیم اور اسلامی اخلاق واقدار کی رہ چھوڑ کر نہ دنیا بنتی ہے اور نہ آخرت۔مگر جدت پسندی کے نام پر مغربی تہذیب کی اندھی تقلید نے بہت سے خاندانوں کو اپنی اصل سے بھٹکانے کی راہ اختیار کی ہے۔کوئی بھی قوم اپنی اصل چھوڑ کر نہ ترقی کرسکتی ہے اور نہ خود کو تسلیم کرواسکتی ہے۔

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

جب مسلمانوں نے اس اصول پر عمل کر کے دنیا کو علم وعقیدے کی روشنی سے منور کیا تو تاریکی میں ڈوبے ہوئے مغرب نے تہذیب اسلام کے قندیلوں سے اپنے چراغ روشن کیے اور ہم نے وہ ترک کر دیا جس سے مغرب نے ہدایت لے کر ترقی کا تاج اپنے سر پر رکھا۔

عظمتِ اونسیت از چنگ و رباب
نہ ز رقصِ دخترانِ بے حجاب
عظمتِ افرنگ از علم و فن است
ازہمیں آتش چراغش روشن است

قران کی انفرادیت

پورا قران حکیم ایک ساتھ نازل نہیں ہوا۔ بلکہ مختلف مواقع پر حسب ضرورت و مصلحت بذریعہ وحی چھوٹی بڑی آیتوں (سورتوں) کی شکل میں رفتہ رفتہ نازل ہوا ہے۔ اس کی آیتوں اور سورتوں کی ترتیب حضور اکرام ﷺ کے زمانے میں ہی آپ کی منظوری سے مکمل ہو چکی تھی خلفیۂ سوم حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اس کی تحریر و اشاعت کا کام مکمل ہوا۔ یہ واحد آسمانی کتاب ہے جو قیامت تک ہدایت برائے خاص و عام اور ناقابل تغیر ہے دنیا کی تمام دستیاب کتب میں یہ واحد کتاب ہے جو درج ذیل خواص کی حامل ہے۔

☆ یہ کتابِ مبین انسانی ذہن کی پیداوار نہیں بلکہ وحی کی زبان میں نازل ہونے والی وہ واحد کتاب ہے جس کی تدوین اپنے رسول ﷺ کی حیات میں ہی ہوگئی تھی۔

☆ قران حکیم کا ایک اعجاز یہ بھی ہے کہ زبان دانی کے بغیر بھی اور مفہوم و معنی کی واقفیت نہ ہونے کے باوجود لاکھوں افراد کو پورا قران پاک حفظ اور رواں ہے۔

☆ تیسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ قرأت کے اصولی اختلاف سے قطع نظر اس کے کسی تلفظ یا زیر زبر پیش پر بھی پوری دنیا میں کسی کو اختلاف نہیں ہے۔

☆ قران پاک کے بہت سی زبانوں میں تراجم ہوئے ہیں مگر کسی بھی زبان میں قرانِ پاک بغیر اصل متن کے شائع نہیں کیا جاتا کہ کہیں علاقائی زبانوں میں اس کا ترجمہ پڑھنے والے اصل سے غافل نہ ہو جائیں یہ امتیاز بھی قران پاک کو ہی حاصل ہے۔

☆ پوری دنیا میں شب و روز جس کثرت سے قران پاک اور اس کی آیات اور سورتوں کی جتنی تلاوت کی جاتی ہے کسی دوسری تحریر کو یہ اعزاز حاصل نہیں۔

☆ قران پاک وہ واحد کتاب ہے جس میں قیامت تک نسل انسانی کو پیش آنے والے تمام مسائل کا مجمل یا مفصّل حل یا اس کے اصول مندرج ہیں۔

قران حکیم کی آیات یا سورتیں جس طرح مرتب ہو چکی ہیں ان میں کسی کو ترمیم کی اجازت نہیں۔ یہ بات اداب تلاوت میں لازم ہے کہ قران پاک کو چند آیات یا ایک سورت درمیان میں حذف کر کے پڑھنے کی اجازت نہیں اور نہ ہی پہلی سورت بعد میں اور بعد کی صورت پہلے پڑھنے کی اجازت ہے عام تلاوت کے علاوہ نماز میں بھی بعد سورۂ فاتحہ پڑھی جانے والی سورتوں میں بھی یہ اہتمام لازم ہے ویسے انفرادی سورتوں کے ورد میں یہ پابندی نہیں ہے۔ مگر عام تلاوت میں ترتیب لازم اور ترتیل افضل ہے۔

جہاں تک قران پاک کی تعظیم کا تعلق ہے تو اس کا پہلا نکتہ تو یہ ہی ہے کہ اس کو سمجھ کر یا بغیر سمجھے ''حق سمجھنا اور اس پر ایمان لانا لازم ہے'' یہ کاغذ پر لکھا ہو...... کہ سینوں میں محفوظ ہو...... زبان پر جاری ہو...... یا لوح محفوظ پر ہو بہر شکل کلام الٰہی اور موجب تعظیم و تکریم ہے۔ اکثر لوگ اسی احترام کے جذبہ سے اس کی تلاوت باوضو کرتے ہیں یہ عمل (وضو) پسندیدہ ہے مگر لازم نہیں۔

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لا الٰہ الا اللہ

برصغیر اور بہت سے دیگر ممالک میں اسے ایک غلاف میں رکھا جاتا ہے اور رحل پر تلاوت کی جاتی ہے اس غلاف کو ''جز دان'' کہتے ہیں شاید اس لیئے کہ اس

کے تیس اجزاء یا ''سی پارے''۔۔۔۔۔۔وہ بھی ترتیب سے رکھے جاتے ہیں۔ سی پاروں کی تقسیم کے نقطہ آغاز کا راقم کو علم نہیں شاید تقسیم تیس روزہ تراویح میں ایک پارہ روزانہ پڑھنے کی سہولت کے لحاظ سے کی گئی ورنہ عہد نبوی میں قران ۱۱۴ سورتوں اور ۶۲۳۸ آیات پر مشتمل تھا جیسا آج موجود ہے اور جسے پاروں میں نہیں سورتوں میں تقسیم کیا جاتا تھا ویسے پارہ فارسی لفظ ہے اور فارسی میں ہی ''سی'' (۳۰) کو کہتے ہیں چنانچہ ''سی پارے'' عربی ترکیب نہیں ہے۔ یہ اصطلاح فارسی اثر کے تحت اسی طرح رائج ہوئی ہے جیسے 'اللہ' کی جگہ ''خدا'' ''صلوٰۃ'' کی جگہ ''نماز'' اور ''صوم'' کی جگہ ''روزہ''! ہمیں کسی بھی زبان یا تمدن کے ایسے غلبہ سے بچنا چاہیئے جو ہمارے اساسی معتقدات کو در پردہ کمزور کرے......راقم کے نزدیک ''یا اللہ'' کا ورد موجب ثواب ہے ''یا خدا'' کا نہیں اسی طرح ''السّلام علیکم'' کی جگہ آداب عرض......اور اللہ حافظ کی جگہ ''خدا حافظ'' مناسب نہیں۔ ایسے چھوٹے چھوٹے ''آداب و معمولات'' کی کجی سے بچنے کے لیئے ہی یہ کتاب مرتب کی گئی ہے۔

تفہیم قران

قران حکیم کی تنزیل کا مقصد بنی نوع انسان کے معتقدات کو درست، اس کے قول و فعل اور نیت و کردار کو حقانیت سے مزین کرنا ہے کہ افراد کے سنبھلنے سے ہی اقوام سنبھلتی ہیں قران حکیم کا لہجہ سماجیاتی (Sociological) نہیں بلکہ نفسیاتی (Psychological) ہے حضور اکرم ﷺ نے افراد کی کردار سازی کر کے ہی معاشرہ کی اصلاح کی اور ویسے بھی فرد اول یعنی ''شکم مادر'' میں بھی اور آخر یعنی ''قبر'' میں بھی اکیلا ہی ہے۔ سوال جواب، گناہ ثواب اور جزا و سزا کے تمام حوالے ''فرد''

کی نسبت سے ہی ہیں اور معاشرہ کی اساسی اکائی بھی فرد ہی ہے۔ گذشتہ ۲۰۰ دوسو سال نے سماجی علوم کی ترقی کے حوالے سے معاشرے کو جو اکائی بنانے کی کوشش کی ہے اس سے فرد اور اس کے معتقدات اور اس کا احساس ذمہ داری کم ہو کر معاشرے کو اپنی کوتاہوں کا ذمہ دار ٹھہرانے کا عادی ہو گیا ہے۔ حشر میں یہ عذر نہیں سنا جائے گا کہ سب ھی ایسا کر رہے تھے! یہ عرض کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہر فرد کو الگ الگ اپنی ذمہ داری کا انفرادی احساس کرنا ہے اور اس کے لیئے ہماری رہنما کتاب قیامت تک کے لیئے قران حکیم ہے۔ اسے پڑھنا اور سمجھنا دونوں ہی اعمال ضروری ہیں۔ اور تفہیم قران کے حوالے سے یہ بات ذہن نشین کرنی چاہیئے کہ قران پاک کا فہم لُغت کے ذریعہ ممکن نہیں ہے اس کی شارح حضور اکرم ﷺ کی ذات پاک، آپ کی احادیث اور سنن ہیں۔ کیا لغت کے ذریعہ ''تفہیم القران'' کے دعویدار ''الف۔ لام۔ میم'' کے معنی بتا سکتے ہیں اور ذرا آگے بڑھیے کیا کوئی ہے جو ''اقیم الصلوٰۃ'' کے معنی سنن و حدیث کے بغیر بتا سکے؟

راقم نے عجائبات قران میں یہ جملہ پڑھا کہ...... ''جو فرق خدائے تعالیٰ اور رسول پاک کے مدارج میں ہے وہی فرق قران اور حدیث میں ہے'' یہ جملہ پڑھ کر افسوس ہوا کہ ذاتِ باری تعالیٰ کے لیئے مدارج کا حوالہ نامناسب ہے وہ تو درجات و مراتب کا خالق اسے کس طرح کسی درجہ سے متعلق کیا جا سکتا ہے۔ آگے اسی صفحہ پر درج ہے کہ...... حدیث شریف کی صحت کا دارو مدار قران شریف پر ہے...... یہ صحت حدیث کا اصول ہے رتبۂ حدیث کا نہیں...... راقم کا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ جس طرح رسول پاک کے بغیر خدا تک رسائی ممکن نہیں ہے اسی طرح احدیث کے بغیر مفہوم قران تک رسائی ممکن نہیں...... غرض یہ کہ تفہیم قران کے لیئے مطالعہ حدیث لازم ہے۔

راقم کا خیال یہ ہے کہ دینی مدارس میں تدریس قران وحدیث کے ساتھ علوم دنیاوی نیز کسی ایک ''غیر ملکی زبان'' کی تدریس بھی ہونی چاہیئے تاکہ دینی مدرسہ کا فارغ التحصیل علوم دنیاوی سے آشنا ہونے کے ساتھ دیگر اقوام میں اسلام کا پیغام ان کی ہی زبان میں پہچانے کے لائق ہو سکے۔

چند دیگر پہلو

بچہ کو ولادت سے لیکر نو بلوغ کی عمر تک پہنچے کے لیئے یعنی شیر خواری۔ بسم اللہ خوانی، تعلیم القران، ختم القران اور درس حدیث کی منزل تک کے لیئے کم وبیش دس بارہ سال کا عرصہ درکار ہوتا ہے اور خود کفالت کی منزل بالعموم ۱۶ تا ۱۸ سال کی عمر میں حاصل ہوتی ہے شاید کسی دوسرے جانور کے بچہ کی نشو ونما اور آموزش کی رفتار اتنی ست نہیں ہے جتنی انسان کی ہے اس ست رفتاری کا مثبت پہلو یہ ہے کہ بچہ کو ''آموزش'' یعنی Learning کے لیئے جس قدر مہلت ملتی ہے اتنی کسی دوسرے حیوان کو میسر نہیں بعض حیوانات کی عمریں تو انسان سے زیادہ ہوتی ہیں مگر بلوغ کی منزل کسی کے لیئے بھی اتنی طویل نہیں۔

آموزش کے عمل کی ست رفتاری کا ایک لازمہ یہ بھی ہے کہ انسانی آموزش کی جہات بھی اتنی کثیر ہیں جو کسی دوسرے حیوان میں نہیں اوپر بیان کردہ چند جہات کے علاوہ بھی بچہ اپنے عہد طفلی میں نو بلوغ تک متعدد کرداری نمونے اور اقدار سیکھ لیتا ہے جس میں چند اہم درج ذیل ہیں۔

زبان وعلم

اسلامی معاشرہ میں علم کو جس قدر اہمیت دی گئی ہے شاید ایمان کے بعد وہی

سب سے اہم ہے جیسا کہ گذشتہ صفحات میں بیان کیا گیا ہے کہ آدم کا شرف علم ہے۔ سرکار ﷺ مدینۃ العلم ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ باب العلم ہیں۔ حصول علم جملہ مومنین و مومنات پر واجب ہے علم کے لفظی معنی تو ''جاننے'' کے ہیں مگر جاننے کا یہ عمل مجرد نہیں اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو اس مفہوم یعنی جاننے کی گرفت میں تمام وجود ہیں..... ذات باری تعالیٰ کو جاننا ''معرفت''...... کائنات کو جاننا ''سائنس''......خود کو جاننا ''نفسیات'' یا معرفتِ ذات'' ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علماء کا درجہ نیابت رسول ﷺ ہے۔......علم ایک کتابی ہوتا ہے ایک لدُنّی اوّل کسبی ہے آخر ''عطائی'' ہے......انسانی کوشش و کاوش سے کتابی علم حاصل ہوتا ہے جس کے حصول کا ذریعہ زبان ہے اور زبان ''قواعد کے تابع الفاظ کی تنظیم'' ہے لفظ کا وجود تین جہاتی ہے ایک جہت لفظ کے معنی ہیں جسے ''تعقل''(Concept) کہتے ہیں۔ دوسری جہت اس کا ''تلفظ'' ہے اور تیسری جہت اس کا ''املا'' کسبی علم کا ذریعۂ حصول وابلاغ زبان و بیان ہے اسی لیئے نبی کریم کی تدریس ظاہرہ کا آغاز ''اقراء'' سے ہوا یعنی حلق سے پڑھنا۔ یہی وجہ کے جسے بر بنیادِ علم خلافت دی گئی اس کی آل کو حیوان ناطق کہا جاتا ہے یعنی علم و نطق کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

مندرجہ بالا مباحث سے جو بات اخذ ہوتی ہے وہ یہ کہ اسلامی نظام اخلاق میں والدین کی ذمہ داری بچہ کو نطقِ کاملہ کی تعلیم دینا ہے یعنی اپنی تینوں جہتوں کے ساتھ الفاظ سکھانے ہیں جدید تحقیقات کی رو سے ماہرین نفسیات بھی فرد کے ذخیرۂ الفاظ کو ہی ذہانت کا ایک اہم اور معتبر پیمانہ تصور کرتے ہیں۔ دنیا کی تمام زبانوں میں عربی واحد زبان ہے جسمیں ''تلفظ'' یا قرأت کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ دنیا کی مختلف زبانیں بولنے والے اپنے اپنے علاقائی اور تمدنی فرق کے سبب ایک ہی زبان مختلف طریقوں سے بولتے ہیں مگر مختلف زبانیں بولنے والے

قران حکیم کی قرأت (حسب اصول) ایک ہی طرح کرتے ہیں۔ زبان کا شعور اگر بچپن سے ہی اجاگر کردیا جائے تو بچہ ایک اچھا طالب علم اچھا معلّم اور مبلّغ و مقرر بن کے اپنے دین کی بہترین خدمت کرسکتا ہے اسلامی معاشرے کا یہی گوشہ وہ ذریعۂ ہدایت ہے جس کی معرفت اہل مغرب عہد تاریک سے نکل کر علمائے اسلام کی تلمیذ کے ذریعہ ہی ترقی کی راہ پر گامزن ہوئے اور انہیں عربی زبان کی معرفت ہی قدیم تہذیب وفلسفۂ ونظریات سے آگہی حاصل ہوئی۔

آدابِ خورد و نوش

بچہ اپنے ابتدائی ایام زندگی میں صرف ایسے ہی چند موضوعات تک اپنی آموزش کو محدود نہیں رکھتا جن کا حوالہ سطور بالا میں دیا گیا ہے اس کی آموزش شعوری و لاشعوری ہر لحاظ سے ہمہ جہاتی ہوتی ہے ان جہات میں ایک اہم جہت آداب خورد نوش ہیں دنیا کے مختلف تمدن۔ مختلف ممالک واقوام کا جائزہ لیجئے ہر ایک کا اپنا ایک مخصوص طریقہ ہے کیا کھائے کیا نہ کھائے کیسے کھائے کیسے نہ کھائے اس ضمن میں بھی اسلامی اخلاقی نظامِ اقدار کو ایک انفرادیت حاصل ہے کہ رنگ و نسل وزبان وثقافت کے اختلافات کے باوجود سب کے لیئے آدابِ خورد ونوش یکساں ہیں اس ضمن میں درج ذیل تصورات وآداب قابل بیان ہیں۔

☆ سب سے پہلا تصور یا عقیدہ یہ ہے کہ ''اللہ رازق ہے'' وہ اپنے بندوں پر مہربان ہے اور جسے جتنا چاہتا ہے رزق بغیر حساب دیتا ہے۔ ظاہری ذریعہ کچھ بھی ہو رازق حقیقی اللہ ہے کسی کو وافر اور کسی کو نپا تلا رزق دینے والا ہے چنانچہ بندے پر لازم ہے کہ اسے کھانے کے لیئے جو میسر آئے وہ اس طرح کھائے کہ جیسے غلام اپنے آقا کا عطا کردہ رزق عجز وانکساری سے کھاتا ہے۔

☆ جب کھائے تو بسمہ اللہ پڑھ کے کھائے۔ ،

☆ دائیں ہاتھ سے کھائے

☆ زمیں پر بیٹھ کر کھائے ازروئے شریعت دستر خوان کو سینوں تک لانا ناپسندیدہ ہے۔

☆ جو کھائے وہ حلال اور جائز طریقے سے حاصل کردہ ہو

☆ ازروئے شریعت اسے جائز قرار دیا گیا ہو۔ اگر تین وقت سے زیادہ کا فاقہ زدہ شخص ہو تو صرف ضروری مقدار تک یہ شرط موقوف ہو جاتی ہے۔

☆ اگر کھانے میں گوشت شامل ہے تو وہ ذبح کیئے ہوئے حلال جانور کا ہو جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔

☆ جب کھانا کھائے تو برتن صاف کرے اور انگلیوں میں یا برتن میں لگی ہوئی غذا نہ چھوڑے۔

☆ کھانا صرف اتنی مقدار میں کھانا چاہیئے کہ بھوک کی تسکین ہو جائے مگر بسیار خوری (over eating) نہ ہو۔

☆ اگر ایک برتن میں کئی لوگ کھا رہے ہوں تو اپنے آگے کا کھانا کھائے، ہاتھ بڑھا کر دوسروں کے آگے سے جھپٹے نہ مارے۔

☆ اگر کسی بڑے برتن سے اپنے لیئے علیحدہ برتن میں کھانا نکالے تو ہوس ناک نہ بنے تھوڑا کھانا نکالے خواہ بار بار لینا پڑے آج کل دعوتوں میں عام طور سے دیکھا گیا ہے کہ بچے ہی نہیں ان کے والدین بھی اپنے اور اپنے بچوں

کے لیئے اس قدر وافر مقدار میں کھانا نکال لیتے ہیں کہ آدھے سے زیادہ کھانا جھوٹا ہو کر برباد جاتا ہے یہ عمل اسلامی اقدار کی روح کے خلاف غیر مہذب اور ناپسندیدہ ہے۔

☆ کھانا بیٹھ کر سیدھے ہاتھ سے چھوٹے نوالے اور چبا چبا کر کھانا چاہیئے۔ بڑے نوالے منہ بھر کے اور بکرے کی طرح جبڑے چلا کر کھانا نامناسب ہے۔

☆ کھانے کے دوران باتیں کرنا اور قہقہے لگانا یا پیٹھ ٹیک کر کھانا منع ہے۔

☆ بین الاقوامی طور سے کھانے کے دو وقت اور دو ناشتہ کے مقرر ہیں (صبح اور سہ پہر) مگر اسلامی اخلاقی نظام میں ''نہ کھانے'' کے اوقات کی بھی نشاندہی کی گئی ہے اول گرہن کے دوران کھانا منع ہے دوم ماہ رمضان میں طلوع تا غروب کھانا (عام بالغ فرد کے لیئے) منع ہے۔

☆ کھانے کے دوران پانی پینے کی ترغیب ہے۔

☆ پانی دو یا تین سانسوں میں پینا چاہیئے

☆ گلاس یا کٹورے میں پانی چھوڑنا نہیں چاہیئے

☆ پانی کے علاوہ دیگر مشروب چائے۔ شربت۔ بوتل وغیرہ میں ایک دو گھونٹ چھوڑنے کا فیشن خبائث کے لیئے حصّہ چھوڑنے کے مترادف ہے۔ کھانے کے برتن کی طرح پینے کا برتن بھی پوری طرح خالی کر لینا چاہیئے۔

☆ کھانے سے پہلے بھی اور بعد بھی ہاتھ دھونا مفید اور پسندیدہ عمل ہے۔

صفائی اور طہارت

گندے، غلیظ۔ ناپاک اور نجاست جیسے اکثر مترادفات ہماری روزمرّہ گفتگو میں استعمال ہوتے ہیں ان میں ناپاک اور نجس کا تصور مذہبی ہے۔ گندے

اور غلیظ کا مفہوم بڑی حد تک طبّی ہے۔ جدید اصطلاحات میں مضر صحت اور مرض پیدا کرنے والے وسیلوں کو گندگی اور غلاظت کا نام دیا جاتا ہے اس کے لیئے صفائی ضروری ہے اور نجس اور ناپاک کے لیئے ''طہارت'' ضروری ہے محض صفائی سے طہارت نہیں ہوتی مگر طہارت میں صفائی کا عنصر شامل ہے۔ ناپاک چیزوں میں اول قسم انسانی یا حیوانی جسم کے مخرجات سے خارج ہونے والے مواد ہیں جن میں پیشاب، فضلہ۔ نطفہ اور خون (حیض ونفاس بالخصوص) نجاستیں ہیں مگر دودھ، پسینہ۔ تھوک، آنسو اور ناک کی ریزش یا پھوڑے پھنسی سے خارج ہونے والا پیپ نجاست میں شامل نہیں مگر ان کی صفائی ضروری ہے یہاں یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیئے کہ پیشاب نطفہ سے بڑی اور شاید سب سے بڑی نجاست ہے۔ بعض دیگر چیزیں جو حیوانی اخراج کی تعریف میں نہیں آتیں مثلاً سور اور اس کا گوشت یا شراب بھی نجاستیں ہیں۔

- ☆ پیشاب اور فضلہ کے اخراج کے بعد استنجاء کافی ہے
- ☆ حیض نفاس اور نطفہ کے اخراج کے بعد غسل لازم ہے۔
- ☆ نماز سے پہلے وضو ضروری ہے اور جمعہ سے قبل غسل
- ☆ ویسے عام حالت میں بھی باوضو رہنا پسندیدہ ہے۔

مندرجہ بالا اعمال طہارت کی تعریف میں آتے ہیں جن کی انجام دہی کے طریقے معروف ہیں اور بچوں کو حسب ضرورت ان کی تفصیلات سے آگاہ کرنا اور ان پر عمل کروانا ضروری ہے۔

جہاں تک صفائی کے عمل کا تعلق ہے اس کے ذریعہ نجاست آنکھ سے اوجھل تو ہوسکتی ہے مگر طہارت نہیں ہوسکتی نجاست کو چاہے کتنا رگڑتے اور دھوتے رہیں

وہ پھیلتی ہی جائے گی مگر ختم نہیں ہوگی۔ نجاست مقررہ طریقے سے دھونے یا پانی بہانے کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول پاک ﷺ کے نام یعنی کلمہ طیبہ سے دور ہوتی ہے اللہ اور رسول پاک کے نام یعنی کلمۂ طیب کی تاثیر یہ ہے کہ اس کے پڑھنے سے زندگی بھر کا کفر اور بداعمالیاں تک دور ہوجاتی ہیں اور سرکار ﷺ کے مطابق جس نے اک بار لاالٰہ الااللّٰہ محمدرسول اللّٰہ کہہ لیا وہ جنتی ہے۔ تو اس کلمہ کا شب روز جس قدر بھی تکرار کیا جائے بہتر ہے آئندہ سطور میں اوراد کے حوالے سے اس تصور کی مزید وضاحت کی جائے گی۔ فی الحال صفائی کے عمل کی وضاحت مقصود ہے۔

ویسے ہندوؤں میں اشنان اور دیگر اقوام میں غسل کا تصور عام اور مقبول ہے صفائی سے گندگی کے اثرات تو دور کیئے جاسکتے ہیں مگر غلیظ مواد خود صاف مواد نہیں بن سکتا آج کی ترقی یافتہ طبی دنیا صفائی کے معاملہ میں ''منہ اور دانتوں'' کی صفائی کو جو اہمیت دیتی ہے وہ حضور اکرم ﷺ سے پہلے کسی نے یہ اہمیت نہیں دی ''مسواک'' آپ کی سنّت ہے صرف دن میں ایک بار ہی نہیں بلکہ کئی بار......! اسی طرح پسینہ کی بدبو سے بچنے کے لیئے اور گرد وغبار کی آلودگی سے صفائی کے لیئے دن میں پانچ مرتبہ وضو لازم ہے اور یہ بھی اس ماحول میں جہاں قلت آب بڑا مسئلہ تھی۔ جمعہ اور عیدین کے اجتماع میں غسل کے ساتھ خوشبوؤں کے استعمال کی بھی تلقین کی گئی ہے۔ مردے کو دفن سے پہلے نہلانا اور کفن دینا اور خوشبو لگانا اختتام زندگی تک صفائی کے عمل کو نظر انداز نہ کرنے کا ایک سبق ہے۔

روزمرہ معمولات زندگی میں حاجاتِ ضروریہ کو رفع کرنے کے لیئے بیت الخلاء میں جاتے وقت بایاں پیر اندر رکھنا اور خبث وخبائث سے اللہ کی پناہ مانگنا۔ باہر آتے وقت دایاں پاؤں باہر نکالنا اور مغفرت طلب کرنا صفائے ظاہر و باطن

کے بابرکت اقدام ہیں جن کی تربیت بچوں کے لیئے ضروری ہے کہ وہ مادّی وغیر مادّی خبث وخبائث سے محفوظ رہ سکیں۔

لباس و پوشاک

جب حضرت آدم علیہ السّلام اور بیوی حوّا کو ارتکاب گناہ کے بعد اپنی برہنگی کا احساس ہوا تو انہوں نے اپنے ستر (جسم) کو پتوں سے ڈھک لیا۔ اس سے اشارہ یہ ملتا ہے کہ پوشاک یا لباس اقتضائے حیاء ہے اور حیا جز و ایمان ہے۔...... ستر پوشی کے اس تصور سے ہٹ کر پوشاک ولباس موسمی تبدیلیوں اور گرم وسرد کے تقاضوں کی تکمیل کے حوالے سے بھی اہم ہے۔ عریانی اور برہنگی اسلام کا ناپسندیدہ عمل ہے۔ اسلام میں ستر پوشی مرد اور عورت ہر دو کے لیئے ضروری ہے۔ ہر دو کے ستر کا تعین جدا جدا ہے عورتوں کا سرِ بازار کھلے سر گھومنا پھرنا نامحرم مردوں سے خلا ملا ہونا اسلام گوارا نہیں کرتا اسی لیئے عورتوں کو پردہ کا حکم ہے اور پردہ بھی کوئی شرعی اصطلاح نہیں ہے یہ فارسی لفظ ہے اور عربی میں اس سے وسیع ترمعنی میں لفظ حجاب استعمال ہوتا ہے حجاب اقتضائے حیا اور حیا جز و ایمان ہے یہاں ایک اور وضاحت بھی کر دوں وہ یہ کہ برہنگی خلوت میں بھی ناپسندیدہ ہے کہ ہم جسے خلوت کہتے ہیں وہ حقیقی خلوت نہیں ہوتی بلکہ غیر مرئی مخلوق کی نگائیں وہاں بھی کام کرتی ہیں اسی لیئے حکم ہے کہ تبدیلی پوشاک کے وقت بھی بسمہ اللہ کر لیا کرو۔ حضرت علی کرم علی وجہہ نے فرمایا کہ انسانی ستر اور جنّاتی آنکھ کے درمیان بسم اللہ کا پردہ ہے۔

نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے برہنگی وعریانی ایک مرض ہے اس کی ایک شکل دوسروں کو اپنا ستر دکھا کر خوش ہونا ہے جسے (Exhibitionism) ستر نمائی کہتے ہیں دوسری

شکل خود کو برہنہ دیکھ کر خوش ہونا ہے جسے (Auto Exhibitionism) کہتے ہیں یہ دراصل جنس زدگی کی ایک شکل ہے جسے (Sex Mania) کہتے ہیں اور اسلام مسلمان ذہن کو نفسیاتی امراض سے پاک دیکھنا چاہتا ہے یہی وجہ ہے کہ اسلام کے آداب خلوت دیگر تمام اخلاقی نظاموں سے برتر ہیں ویسے تو ستر پوشی کا اطلاق تفاوت جنس نمایاں ہونے کے ساتھ ہے مگر بچپن سے ہی اولاد کو برہنگی سے بچانا اور جسم پوشی کی تربیت دینی چاہیئے یہ بڑی ذمہ داری والدین، خاص کر ماں پر عائید ہوتی ہے میرے ماشاء اللہ پانچ بچے ہیں تین بیٹے دو بیٹیاں پانچوں شادی شدہ گھر والے اور صاحب اولاد ہیں۔ مجھے نہیں یاد کہ ان پانچوں میں سے کسی کو بھی کسی عمر میں سرتاپا برہنہ دیکھا ہو اس حسن تربیت کا سہرا ان کی والدہ کے سر ہے اور بحمد اللہ ایسی ہی تربیت کے نتیجہ میں توفیق الٰہی سے سب باحیا اور صحیح القعیدہ ہیں اور انہی خطوط پر اپنی اولاد کی پرورش (امریکہ اور مشرق وسطی میں رہ کر) کر رہے ہیں جس پر ان کی پرورش کی گئی۔

اسلامی اخلاق کی رو سے لباس و پوشاک کے معاملے میں بھی اعتدال کا سبق دیا گیا ہے۔ نہ اتنا چست کی جسم کے چھپانے والے حصّہ بھی ظاہر ہوں اور نہ اتنا ڈھیلا کہ زمیں پر لتھڑتا رہے۔ نہ ایسا کہ رانیں کھلی ہوں اور نہ ایسا کہ ٹخنوں سے نیچے جائے میں نے بعض ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں کہ جن کے پتلون کے پائنچے ان کی ایڑیوں میں آکر کٹ جاتے ہیں اور پتلون کی فولڈ میں بجری اور ریتی بھری ہوتی ہے۔ ایسے نوجوان اگر توفیق ایزدی سے جمعہ کو مسجد میں جائیں تو پائینچے اوپر چڑھا لیتے ہیں یا رکوع کے ساتھ ٹخنوں سے اونچا کر لیتے ہیں میں اسے تعمیل حکم نہیں بدسلیقگی کا نام دیتا ہوں اور ان کے پیچھے غلط تصور کارفرما نظر آتا ہے کہ جیسے انسان صرف نماز میں اللہ تعالیٰ کے سامنے ہوتا ہے اور ویسے نہیں مومن کو تو ہر وقت خلوت

ہو یا جلوت معاشرت ہوکو کہ مباشرت ہر وقت یہ احساس رکھنا ہے کہ اللہ اس کے ساتھ اور اسے دیکھ رہا ہے اور وہ جو کچھ کر رہا ہے وہ لکھا جا رہا ہے اور ایک دن اسے اپنے کیے کا جواب دینا ہے۔

سونا جاگنا

اسلامی اخلاق میں رات سونے کے لیئے نہیں بلکہ ''سو کر اٹھنے کے لیئے ہے'' قرآن پاک میں رسول اکرم ﷺ سے ارشاد کیا گیا کہ رات کو اٹھیے سوائے اس کے کہ جب وہ آدھی یا اس سے کم یا زائد رہ جائے اور قرآن کو ترتیل سے پڑھیئے۔ یہ حکم رسول ﷺ کے لیئے ہے مگر طلوع سے قبل صبح صادق اٹھنا پوری امت کے لیئے لازم ہے ویسے ''جلدی سونا اور جلدی اٹھنا صحت کا بنیادی اصول ہے۔ صد افسوس کہ ملازم پیشہ افراد اور اسکول جانے والے بچوں کے علاوہ بالخصوص تجارت پیشہ حلقے صبح دیر تک سونے کے عادی ہیں جو گیارہ بجے تک پڑے سوتے رہتے ہیں اور بارہ بجے بازار کھولتے ہیں اور دیر تک جاگتے ہیں یہ طریق شعار اسلامیہ کے خلاف ہے پرندوں کی زندگی سے سبق لیجئے کہ طلوع سے پہلے اپنے گھونسلے چھوڑ دیتے ہیں اور غروب کے ساتھ اپنے گھونسلوں میں واپس آجاتے ہیں۔

نیند ہماری ایک عضویاتی ضرورت ہے جو بھوک پیاس شہوت اور آرام کی طرح ایک تقاضائے فطرت ہے اسلامی اخلاق یہاں بھی اعتدال کا درس دیتا ہے نہ تو رات بھر بلکہ بعد طلوع بھی سوتے پڑے رہنے کو سراہتا ہے اور نہ مستقل شب بیداری کا حکم دیتا ہے۔ عام مسلمان کے لیئے لازم ہے کہ وہ بعد عشاء سو جائے صبح صادق اس طرح اٹھے جیسے مؤذن اٹھتا ہے۔

صبح سو کر اٹھنے کے بعد مسنون دعا پڑھنا افضل ہے اگر دعا یاد نہ ہو تو کلمۂ طیبہ پڑھیں اسی طرح سونے سے پہلے بھی استغفار اور بعض دعائیں مستحب ہیں۔ عام نیک مسلمان کو دائیں کروٹ سونا چاہیئے۔ پٹ لیٹ کر سونا ابلیسی عمل ہے۔ انبیاء چت سوتے ہیں اور اولیاء بائیں کروٹ ان تمام پوزیشنز کے رمز ہیں جن کا بیان موجودہ تحریر کے تقاضہ سے بالاتر ہے۔ سونے کی مدت طبّی لحاظ سے چھ یا ساتھ گھنٹے ہے بچہ اپنے ابتدائی دنوں میں زیادہ سوتا اور کم جاگتا ہے جبکہ بالغ زیادہ جاگتا اور کم سوتا ہے مگر دیندار، بزرگ اور اولیاء کم خوردن و کم گفتن کی طرح کم خفتن کے بھی قائل ہیں۔ راقم کے نزدیک رات کو سونے سے پہلے ''آیۃ الکرسی'' پڑھ لینا بہتر ہے کہ اس کی برکت سے پڑھنے والا بدخوابی اور خبث و خبائث سے محفوظ رہتا ہے۔ سوتے وقت ایک ہی کروٹ پڑے رہنا لازم نہیں کروٹیں بدلنے پر کوئی پابندی نہیں بلکہ سوتے ہوئے آدمی پر سے شریعت کا قلم اٹھا ہوا ہے۔ عالم خواب کا کوئی گناہ موجب سزا نہیں البتہ نفسیاتی لحاظ سے لاشعوری محرکات مظہر ہے مگر سزا ''شعور اختیار اور نیت'' کے ساتھ ہے۔

سلام

سلام اور دعا اسلامی اخلاقی نظام کے دو لازمے ہیں۔ دعا کی تفصیلات تو آئندہ صفحات میں بیان کی جائینگی فی الوقت سلام کا مختصر بیان مقصود ہے ''سلام'' کے معنی بھی دعا کے ہیں یعنی مخاطب کے لیئے خیر و برکت چاہنا'' ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کو سلام کرنا خواہ باہم شناسائی ہو یا نہ ہو لازم ہے ویسے ''سلام'' اسمائے الٰہی میں بھی ہے اور رسول وآل رسول پر صلوٰۃ کی طرح واجب ہے ہر مسلمان نماز میں اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ کہتا ہے جو نہ کہنے سے اس کی نماز

نہیں ہوتی ۔ جب کوئی روضۂ اقدس پر حاضری دیتا ہے تو ''السّلام علیک یا رسول اللہ'' کہتا ہے۔ جو مسلمان از روئے عقیدت رسول پاک ﷺ کو اپنے نزدیک تصور کرتے ہیں ویسے بھی یہ مخاطبت اختیار کرتے ہیں میلاد شریف میں باقاعدگی سے اجتماعی سلام پڑھا جاتا ہے یہ ایک ''بدعت حسنہ'' ہے قبرستان میں تمام اہل قبور کو سلام کہا جاتا ہے۔

آداب اسلامیہ کی رو سے کسی محفل میں آنے والا حاضرین کو السّلام علیکم کہتا ہے۔ پہلی ملاقات پر ہی موقوف نہیں سلام بار بار ملاقاتوں پر بھی کیا جاتا ہے۔ بچہ صبح اٹھ کر بڑوں کو سلام کرتا ہے اور دعائیں لیتا ہے۔ اللہ اور اس کے فرشتے نبی پاک ﷺ پر صلوٰۃ بھیجتے ہیں اور مومنین کو ان پر (اور ان کی آل پر) سلام بھیجنے کا حکم ہے۔

سلام کے ساتھ ہی رسول و آل رسول ﷺ پر صلوٰۃ بھیجنا بھی ضروری ہے قران پاک میں جو حکم ''قیام صلوٰۃ'' کا ہے اس کے معنی بھی راقم کے نزدیک ''درود و نماز'' کا نظام قائم کرنے کے ہیں کہ اللہ اور اس کے فرشتوں سے ''صلوٰۃ'' نبی ﷺ پاک کے لیئے ہے تو ''درود'' ہے اور جب رسول ﷺ اور مومنین سے اللہ کے لیئے ہے تو ''نماز'' ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اوپر بیان کردہ جو اسلامی اقدار و اخلاق سے ماخوذ...... اداب و معمولات...... بیان کیئے گئے وہ بچہ کو اس کی زندگی کے ابتدائی سالوں میں سکھا دینے ضروری ہیں کہ یہی آداب و معمولات آئیندہ زندگی میں اس کی نیت و عمل کی صحت کے ضامن ہوتے ہیں۔ دور معصومیت (۴۰ دن تک) دور رضاعت (دو سال تک) دور مکتب (۴ سال چار ماہ سے نو بلوغت تک) تقریبا بارہ سال پر بسیط یہ عہد طفلی کے ادوار ہی بچہ کی شخصیت کی بنیاد بنتے ہیں۔ آگے نو بلوغ۔ بلوغ اور کہولت کے ادوار میں

طفلی کے ہی تعین کردہ خدوخال اجاگر ہوکر نیت عمل اور عقیدہ وشخصیت کی تشکیل کرتے ہیں طفلی کے بعد پہلا دور ''نوبلوغ'' ہے۔

مدرسہ اوراساتذہ

ابتدائی طفلی سے نکلنے کے بعد یعنی بسم اللہ خوانی کے ساتھ جوسلسلۂ تدریس شروع ہوتا ہے اس کے ساتھ ہی بچہ کا تعلق مدرسہ، اساتذہ اور ہم جماعت طالب علموں سے استوار ہوتا ہے۔ مدرسہ میں داخلے کے بعد بچہ تدریسی جماعت کے اداب اساتذہ کا احترام اور ہم جماعت بچوں سے تعلقات استوار کرنا سیکھتا ہے بچہ کی اچھی سیرت وکردار کی تشکیل اس عہد میں ۔ اچھے اسکول اچھے اساتذہ اور اچھے ساتھیوں کے زیراثر ہوتی ہے یہاں اسے والدین اور قریبی رشتہ داروں یا اہل خاندان کے علاوہ اجنبیوں سے بھی مانوسیت پیدا کرنی ہوتی ہے۔ جماعت کا سبق پڑھنا اور سمجھنا گھر پر اسے دوھرانا اپنی کتابیں اور بستہ سنبھالکر رکھنا تو بچہ سیکھتا ہی ہے مگر اسکے ساتھ نظام الاوقات کی پابندی ہمجولی بچوں سے معاملات اور سماجی تعامل بھی بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے ہمجولی بچے کھیل کود اور پڑھنے لکھنے میں ساتھی اور دوست ہونے کے علاوہ بچہ کے استاد بھی ہوتے ہیں کہ وہ ان سے بھی غیر رسمی طور پر بہت کچھ سیکھتا ہے۔

بچہ کے والدین کے ذمہ یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ بچہ کے ہم جماعت اور دوسرے ساتھیوں پر بھی سخت نظر رکھی جائے کہ بچہ یہاں بہت سی اچھی باتیں سیکھنے کے علاوہ بری عادات، بدزبانی، ضد اور دیگر موانع بھی یہیں سے سیکھتا ہے اس ضمن میں والدین اور اساتذہ کی ذمہ داری مشترک ہے اور اسی ذمہ داری کو نبھانے کے صلے میں استاد کو باپ کا درجہ دیا گیا ہے۔

والدین کی ذمہ داری ہے کہ وہ بچہ کو اسکول میں ڈال کر صرف اساتذہ پر نہ چھوڑ دیں بلکہ گاہے بہ گاہے اسکول انتظامیہ اور اساتذہ سے بھی رابطہ رکھیں اور بچہ کی نصابی و ہم نصابی مصروفیات کے ساتھ دیگر اخلاقی اور سماجی اداب کی طرف سے بھی غافل نہ ہوں بچہ کو گھر سے باہر یا اسکول جاتے وقت اللہ حافظ کہیں خدا حافظ کہنا بابرکت کلمہ نہیں ہے کہ خدا اسمائے ربیّ میں شامل نہیں ہے اسی طرح بچہ کو السلام علیکم کہنے کی جگہ ''اداب عرض'' کہنے سے روکیں صرف اشارے سے سلام کرنا بھی اچھا نہیں ہے السّلام علیکم کہنا مسنون بلکہ واجب ہے۔

سلام ہو محمد صلی اللہ علیہ وسلم و آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر

دوسرا باب

نوعمری کے اسلامی آداب و معمولات

نوعمری...... شعور ذات...... حیاتی پہلو...... سماجی پہلو...... نفسیاتی پہلو...... شعورِ جنس...... معیاراتِ خیر و شر...... نوعمری کی ضروریات اور اقدار...... ایمان...... اقدار کی درجہ بندی...... حقوق و فرائض...... حقوق اللہ...... حقوق العباد...... حقوق النفس...... تنقید کا شعور...... آرزوئیں اور مستقبل...... تحریک و مطابقت...... چند اوراد...... کلمۂ طیّبہ...... لاحول...... استغفار...... درود شریف۔

نوعمری، صغیرسنی اور نو بلوغ
(Puberty Adolosence)

جیسا کہ گذشتہ باب میں کہا گیا ہے کہ نشرہ کی تقریب کے وقت تک بچہ کی عمر تقریباً گیارہ بارہ سال کے لگھ بھگ ہو جاتی ہے۔نشو ونما کے نفسیاتی مدارج کی تقسیم کے مطابق یہ عہد ''پیو برٹی (Puberty) کہلاتا ہے۔ یہ عہد طفلی اور بلوغ کے درمیان کا ابتدائی دورِعمر ہے جسے ''صغیرسنی'' کہہ سکتے ہیں۔کم عمری کا یہ عہد نو سال سے شروع ہوکر بارہ تیرہ سال تک بسیط ہے اس کے بعد بارہ تیرہ سال سے ۱۸ تا ۱۲ سال کا عہد ''نو بلوغ'' (Adoloscence) کہلاتا ہے اس کے بعد پکی عمر یا کامل بلوغت کا دور ہے۔

''صغیرسنی'' کا عہد (تقریباً نو سے تیرہ سال تک) نفسیاتی اور سماجی ہر لحاظ سے اہم ترین دور ہے۔ اس دور میں بچہ نے اب تک جو کچھ سنا ہے اسے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے یعنی طفلی ''ماننے کا اور صغیرسنی جاننے'' کا دور ہے اس دور کو شعور کی بیداری کا دور بھی کہہ سکتے ہیں۔شعور کی بیداری کئی جہتوں میں شروع ہوتی ہے۔ جس کے سبب بچہ کے ذہن پر دباؤ زیادہ پڑتا ہے اگر والدین کی دانشمندانہ نگرانی و معاونت نہ ہوتو اسی عمر میں متعدد نفسیاتی امراض کی بنیاد پڑ سکتی ہے۔

پیو برٹی میں بچہ ایک تضاد کا شکار ہوتا ہے کہ بچے اسے بڑا سمجھ کر اور بڑے چھوٹا سمجھ کر اپنانے کے لیئے تیار نہیں ہوتے وہ اس تضاد میں پھنس کر غلط کار ہوسکتا

ہے اس کے ذہنی قویٰ متاثر اور صلاحیتیں مفلوج ہو سکتی ہیں۔ بچہ کا یہ دور والدین سے ایسی نگرانی کا مطالبہ کرتا ہے جو اس میں بصیرت پیدا کرنے کے ساتھ اس کی جذباتی تسکین اور نئے ابھرتے ہوئے شعور کے تقاضے پورے کر سکے اس عہد کے لیئے اسلامی اقدار و اخلاق کی روح یہ ہے کہ والدین اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر برتاؤ نہ کریں کہ جب محبت آئی تو گلے لگا لیا اور جب غصہ آیا تو جھڑک دیا یہ رویہ بچہ میں شیزوفرینک پیچ بو سکتا ہے۔ اسلام اس دور کی تربیت کو خاص اہمیت دیتا ہے۔ اس عہد میں بچہ کے شعور کی بیداری کئی جہتوں میں ہوتی ہے۔ جن میں سے چند اہم حسب ذیل ہیں۔

شعور ذات

بچہ اپنے ابتدائی ایام حیات میں اپنے والدین اور بہن بھائیوں یا چند قریبی اعزاء کا شعور رکھتا اور اپنے روزانہ زیر استعمال آنے والی چیزوں کو جانتا ہے مگر بسیط تر حلقۂ شعور نہیں رکھتا لیکن پیوبرٹی کی عمر کو پہنچتے پہنچتے اس کی نظر ذات و کائنات پر بھی جاتی ہے اس کا ذہن پوچھتا ہے۔

لالہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے؟

اسلامی نظام اخلاق کا تقاضہ یہ ہے کہ اس مرحلہ پر اسے ذات و کائنات کے تصور کے ساتھ تصور الٰہی سے بھی روشناس کرایا جائے اور وہ میرے ماں باپ ، میرے بہن بھائی۔ میری کتابوں سے آگے بڑھ کر میرا اللہ اور میرا رسول کہنا بھی سیکھے۔ اگر وہ اللہ اور رسول کے بغیر ''میں اور میرے'' کے پھیر میں ہی رہا'' تو

آ گے چل کر عجز وانکساری اور کسر نفسی کا درس کس طرح حاصل کرے گا اسی رمز کو علامہ اقبال نے یوں بیان کیا ہے کہ

''خودی کا سرِّ نہاں لا اللہ الااللہ''

بچہ کے حقیقی شعور ذات کی تعمیر میں والدین کا کردار بہت اہم ہے انہیں خیال رکھنا چاہیئے کہ وہ دونوں انتہاؤں میں کسی بھی ایک پر نہ جم جائے کہ ذات کی اثبات میں اس منزل پر پہنچ جائے کہ ''ہمچوں مَن ڈنگرے نیست'' اور نہ ہی احساس کمتری میں مبتلا ہوکر خود کو اتنا حقیر سمجھنے لگے کہ کم ہمت بزدل پست حوصلہ اور ڈرپوک بن کر حالات کا مقابلہ کرنے سے قاصر رہے اس کا تصور ذات حقیقت پسندانہ ہو جیسا کہ سرکار دو عالم ﷺ اگر ایک طرف خود کو عبد عاجز کہتے ہیں تو دوسری طرف یہ بھی فرماتے ہیں کہ تم مجھ کو اپنے اوپر قیاس نہ کرنا یہ دونوں اصول شخصیت کی صحت مند تعمیر کے لیئے مشعل راہ ہیں۔

کبھی جوش جنوں ایسا کہ چھا جاتے ہیں صحرا پر
کبھی ذرہ میں گم ہو کر اسے صحرا سمجھتے ہیں

حقیقی تصورِ ذات وہی ہے جو دوسروں کی نظر میں فرد کے تصور سے ہم آہنگ ہو اور اس میں اتنی لچک اور تحمل ہو کہ

ہو محفل یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

شعور ذات کی تکمیل کا جو عمل کم عمری یا صغیر سنی سے شروع ہو کر بلوغ تک جاری رہتا ہے بلکہ اس کے بعد بھی ایک ارتقائی عمل سے گزرتا رہتا ہے۔ درج ذیل تین پہلوؤں پر مشتمل ہوتا ہے۔

ا۔ حیاتی پہلو:

''میں'' صرف ایک احساساتی متخیلہ وجود ہی نہیں بلکہ ''میں'' میں گوشت پوست کے بنے ہوئے مادّی جسم کا بھی تصور شامل ہے مشاہدے میں آیا ہے کہ اس عمر میں خاص طور سے لڑکیاں اپنی جسامت اور اعضاء کی ساخت وتناسب کے بہترین کرنے کے چکر میں مبتلا ہو کر خوردونوش پر غیر ضروری پابندیاں عاید کر کے وزن کم کر کے تعطل حیض اور قبض کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اس موقع پر والدین کی ذمہ داری ہے کہ وہ لڑکیوں کے جاذب نظر اور خوش ساخت نظر آنے کے تصور کی نفی تو نہ کریں مگر اسے ''مرض'' نہ بننے دیں اور انہیں یہ شعور دیں کہ اصل حسن ''حسن سیرت ہے'' وہ صورت وجسم کے ساتھ سیرت وکردار کو دل آویز بنانے پر بھی توجہ دیں شکیسپیر کے بقول A beutious wall doth oft close a bad soul

حُسنِ سیرت جو نہیں حُسن میں کیا رکھا ہے۔

ب۔ سماجی پہلو:

شعور ذات کا دوسرا اہم عنصر فرد کی ذات کا سماجی پہلو ہے۔ ''وہ شخص اچھا ہے جو خود کو اچھا نہ کہے بلکہ دوسرے اسے اچھا کہیں'...... اور وہ برا ہے جو خود کو اچھا سمجھے اور دوسرے اسے اچھا نہ سمجھیں۔ فرد کی حقیقی ذات وہی ہے جو اپنے نیت و عمل کے ذریعہ اپنے احباب واعزا واقارب پر ظاہر ہو اور اسی حوالے سے دوسروں کے ذہن میں اس کا تصور بنے۔ یہاں بھی اسلامی اخلاقی نظام کا بنیادی صول ''اعتدال'' ملحوظ رہنا چاہیئے ایسا نہ ہو کہ بچہ دوسروں کی نظر میں اچھا بننے کی آرزو کو ہی سب کچھ سمجھ لے یہاں یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ اچھے اسے

اچھا کہیں ورنہ ہمارے اخلاقی نظام میں کثرت رائے حقانیت کا معیار نہیں ہمارے خیر وشر کے معیارات کثرت رائے کے بجائے کتاب اللہ کے بنائے ہوئے اصولوں سے متعین ہوتے ہیں یہ شعور اسی عمر سے بچوں میں بھی اجاگر کرنا چاہیئے ہمارے ہاں اچھا وہ ہے جو دوسروں کے حقوق اور اپنے فرائض اقدارِ اسلامیہ کے مطابق انجام دے یہیں سے تقویٰ کی بنیاد پڑتی ہے جو بندۂ مومن کی معراج اور ذات کا جزوِ لازم ہے۔

ج۔ نفسیاتی پہلو:

نفسیاتی لحاظ سے ذات کے صحت مند تصور میں ''مطابقت صحیحہ'' کا ہونا لازم ہے یعنی فرد اپنی خواہشات اور اخلاقی بندشوں کے درمیان توازن اور مطابقت رکھتا ہو۔نوعمر بچہ کو نہ تو اپنی صحت مند نفسیاتی ضرورتوں کا شعور ہوتا ہے اور نہ خیر وشر یعنی اچھے برے کی قدروں کی مکمل آگہی۔ اس منزل پر والدین اور اساتذہ کی مشترکہ ذمہ داری ہے کہ وہ بچہ میں صحیح فکر اور اقدار کا وہ اسلامی تہذیبی شعور پیدا کریں جو قران وحدیث، سیرت نبوی اور سیرت صالحین سے متعین ہوتا ہے۔

صحت مند آدمی اپنے تصور ذات سے مطمئن بھی ہوتا ہے اور غیر مطمئن بھی اطمینان اس حد تک کہ فرد ناکامی اور شکست ومحرومی کے اثرات میں مبتلا ہوکر مایوسی اور قنوط کا شکار نہ ہوجائے ......اور غیر مطمئن اس حد تک کہ اس میں حسنِ عمل وسیرت کے لیئے تحریک پیدا ہوتی رہے انسان نہ فرشتہ ہے نہ شیطان دونوں کے درمیان ہے جس کے سبب اس میں ''گناہ اور توبہ'' دونوں کا میلان ہے اور اسی کے سبب وہ مخلوق میں اشرف ہے۔ یہ خصوصیت ہی اس میں حسنِ عمل پیدا کرتی ہے جس کے سہارے وہ ''ذاتِ موجودہ سے ذاتِ متصورہ'' کی طرف بڑھتا ہے

اوراس سفر میں اپنے نظام کے اداب و معمولات ملحوظ رکھتا ہے جس سے متعدد نفسیاتی کرداری نمونے تشکیل پاتے ہیں جن کی تفصیلات آئندہ صفحات میں پیش کی جائینگی۔

شعور جنس

طفلی کے ابتدائی مراحل میں نہ تو بچہ کو اپنی جنس کا شعور ہوتا ہے اور نہ جنس مخالف کا مگر پیوبرٹی کی منزل پر پہنچتے پہنچتے اسے لڑکے اور لڑکی کے جسم کی نشو ونما میں فرق کا شعور پیدا ہونا شروع ہوتا ہے جسے ''شعور جنس'' کہتے ہیں۔جنس کا شعور حاصل ہونے سے اس میں متعدد ذہنی اور نفسیاتی تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں جس سے اس کے کردار اور رویّوں میں فرق پیدا ہوتا ہے والدین کو ان تغیّرات پر کڑی نظر رکھنی چاہیئے کہ ان کے زیراثر وہ جنسی رویّے تشکیل پاتے ہیں جو مستقبل میں اس کے جنسی کردار کا تعین کرتے ہیں یہیں سے احساس ''حیا'' کی بنیاد پڑتی ہے جو اگر پوری طرح نشونما نہ پاسکے تو ذہن عریانی اور فحاشی کی طرف راغب ہوتا ہے اور رفتہ رفتہ ''بچہ بلکہ نوعمر جوان'' نوبلوغ سے ہی بری جنسی عادتوں مشت زنی، انگشت زنی اور خودلذتی کی خبیثانہ عادت کا شکار ہوکر زندگی برباد کرلیتا ہے۔

بعض والدین کا یہ تصور بالکل غلط ہے کہ جنس بلوغ کے بعد کا مسئلہ ہے۔سگمنڈ فرائڈ ماہرنفسیات تحلیل نفسی کہتا ہے کہ ''بغیر جنسی جبلّت کے بچہ کا تصور ایسا ہی ہے جیسے بغیر جنسی عضو کے''......اس کے نزدیک بچہ کی جنسی جبلت کے اظہار کے ذرائع مختلف ادوار عمر میں مختلف ہوتے ہیں جو پیوبرٹی سے اپنی مستقل راہ کا تعین کرتے ہیں۔

جنسی شعور کی تشکیل کے آغاز سے باہم کھیلنے والے لڑکے اور لڑکیوں کے رویّے ایک دوسرے کے لیئے اپنے ہم جنسوں کے مقابلے میں مختلف ہوجاتے ہیں۔یہیں

سے مردوزن کے مختلف جنسی رویّوں کی بنیاد پڑتی ہے۔اس موڑ پر لڑکے اور لڑکی کو جسمانی لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہونے کا شدید احساس ہوتا ہے لڑکے کے چہرے پر داڑھی کے بال اور مونچھ کے بال سب سے بڑا جنسی امتیاز ہے۔ پھر لڑکے کی آواز بھاری ہو کر مردانگی کی غماز ہو جاتی اور لڑکی کی آواز میں نسوانیت آجاتی ہے لڑکے کی داڑھی مونچھوں کی طرح لڑکی کا جسمانی امیتاز اس کے پستانوں کا نمایاں ہونا ہے ایسی تبدیلیوں کے ساتھ لباس بھی ایک دوسرے سے مختلف ہونے لگتے ہیں آسائش و زیبائش کا احساس بھی بڑھتا ہے زیر ناف بھی بال بڑھنے لگتے ہیں اور بچہ کو ان تمام تبدیلیوں کے زیر اثر اپنے طفلانہ رویّے ترک کر کے بالغانہ رویّوں کو اپنانے کی کوشش میں سخت ذہنی دباؤ کا سامنا ہوتا ہے۔اس عمر سے شروع ہونے والے آداب میں سر ڈھکنا ایک اہم قدر ہے لڑکی کے کھلے سر اور بکھرے بال پھرنے سے بالوں میں خبائث گھر کر لیتے ہیں یہ محض واہمہ نہیں بلکہ راقم کا تصدیق شدہ مشاہدہ ہے سر ڈھکنا صرف لڑکیوں کے لیئے ہی لازم نہیں بلکہ لڑکوں کو بھی ٹوپی کا عادی بنایا جاتا ہے ویسے تو ٹوپی پہنے رہنا ایک سعادت مندانہ عمل ہے مگر تلاوت میں نماز میں اور کھانا کھاتے وقت برہنہ سر رہنا اچھی بات نہیں۔مگر آج لڑکے تو کجا لڑکیاں بھی برہنہ سر رہتی ہیں جن میں سے چند نیک سمجھی جانے والی لڑکیاں اور خواتین صرف اذان کے وقت سر ڈھک لیتی ہیں یہ بھی غنیمت ہے کہ اچھا کرتی نہیں ہیں مگر اچھے کو اچھا سمجھتی ہیں۔یہ والدین کی ذمہ داری ہے کہ بچوں کو ''پیوبرٹی'' کے تغیرات کے ساتھ اسلامی اور سماجی مضمرات سے آگاہ کریں...... ماں کے لیے ضروری ہے کہ وہ لڑکی کو آغازِ حیض سے قبل ہی اس کی تفصیلات سے آگاہ کردے۔ ناواقفیت میں اجرائے خون کے آغاز سے لڑکیاں ہیبت زدہ ہو جاتی ہیں۔اسی طرح باب کو چاہیئے کہ وہ لڑکے کو احتلام کی معلومات بلواسطہ یا بلا واسطہ فراہم کرے۔نیز دونوں کو غسل وطہارت کے مسائل سے بھی آگاہ کرنا ضروری ہے۔

معیاراتِ خیر وشر

اوپر بیان شدہ جنسی حوالے کے علاوہ دیگر حوالوں سے بھی اس عمر کا سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ ''صحیح کیا ہے غلط کیا ہے'' کیا اچھا ہے کیا برا؟ کیا کریں کیا نہ کریں۔ ویسے تو یہ سوال زندگی کے آخری لمحوں تک اٹھتا رہتا ہے مگر اس کا آغاز صغیرسنی سے ہوتا ہے جب نوعمر'' کیوں کیسے اور کیا'' کی گنجلک میں پھنسا ہوتا ہے۔ اسلامی اخلاقی نظام کی رو سے بچہ کو بچپن سے ہی حق شناسی کا شعور ملنا چاہیئے اور والدین کو یہ حقیقت اس کے ذہن نشین کر دینا چاہیئے کہ ہمارے نظام خیر وشر یا جائز ناجائز یا صحیح اور غلط کی قدریں مستقل ہیں جو سچ اور صحیح ہے وہ ہر حال میں سچ ہے بالائے دار بھی اور تہہ تیغ بھی اور جو غلط ہے وہ غلط ہے ہمارے اخلاقی نظام کے مطابق خیر وشر اور نیک و بد کا تصور مستقل ہے اور اس کے درج ذیل ذرائع ہیں۔

☆ قران حکیم

قران حکیم نے جسے سچ، خیر اور حق کہا وہ ''سچ'' ہے اس کتاب مبین میں قیامت تک پیدا ہونے والے تمام انسانی مسائل کے لیئے مجمل یا مفصل معلومات وہدایات درج ہیں۔

☆ حدیث شریف

قران کے احکامات کی شرح و توضیح حدیث شریف سے ہوتی ہے اور حدیث شریف ہمارے معیارات خیر شر کا دوسرا اہم ذریعہ ہے یعنی پہلے اللہ کا کلام پھر رسول کا کلام رسول پاک کا کوئی فرمان درس یا نصیحت کلام الٰہی سے متصادم نہیں بلکہ شارح و معاون ہے۔

☆ اجماعِ امت

اجماعِ امت کے معنی امت کے اولیاء وعلماء کا کسی ایک ایسے نقطہ پر متفق ہو جانا ہے جو کلام اللہ اور حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہی ماخوذ ہو۔

☆ قیاس

قیاس بھی ہمارے اجتہاد کا ایک اصول ہے مگر بچے یا نوعمر کے ذہن کو اس میں نہیں الجھنا چاہیئے کہ یہ امام ابو حنیفہ جیسے بالغ نظر شخص کا ہی حصّہ ہے۔

ہمیں تو سیدھے سادھے مسلمان کی طرح اس کو سچ ماننا چاہیئے جو اللہ اور رسول کے حکم کے مطابق ہو اور جسے اولیا وعلمائے امت کی تعبیری تائید حاصل ہو۔ اگر اس عمر سے بچے کے ذہن میں قران وحدیث اور اجماعِ امت کو معیار خیر وشر کی حیثیت سے پختہ تر کر دیا جائے تو زندگی بھر کے لیئے فرد خیر وشر کی دوئی کے شر سے آزاد ہو جاتا ہے اور صغیرسنی کی مدت اس فہم کی متقاضی ہے۔

زندگی کا یہ دور والدین کے صحت مند اخلاقی اور تہذیبی رویوں کا متقاضی ہے اسلامی تہذیب واخلاق کے مطابق یہی عمر بچے میں اسلامی اقدار ومعمولات کا شعور پیدا کرنے اور ان کی آموزش کے لیئے نہایت اہم ہے۔

☆ نوعمری کی ضروریات واقدار

عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ بچہ کی ضروریات اور ان کی تسکین کے ذرائع کا شعور بھی پیدا ہوتا ہے اس کی دنیا وسیع سے وسیع تر ہوتی جاتی ہے۔ وہ پہلے جو کچھ بغیر سمجھے ہوئے کرتا تھا اب اسے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی خواہشات و ضروریات کا دائرہ وسیع ہونے لگتا ہے اور ان خواہشات وضروریات کی تسکین

کے ذرائع کا بھی اسے شعور ہوتا ہے اور ایسے بہت سے کام جن کی انجام دہی میں وہ والدین پر انحصار کرتا تھا اب احساس ذمہ داری کے ساتھ خود انجام دیتا ہے۔ کونسی خواہشات پسندیدہ اور کونسی ضروریات اہم ہیں ان کی تسکین کے ذرائع کیا ہیں ان میں سے کونسے ذرائع استعمال کرنے چاہیں اور کونسے نہیں۔ کیا جائز ہے اور کیا ناجائز غرض یہ کہ یہیں سے اقدار کا یا وسیع تر مفہوم میں خیر وشر اور جائز و ناجائز کا شعور بیدار ہوتا ہے ہمارا اخلاقی نظام ایسا نہیں ہے کہ اگر بعض دیگر ممالک کی طرح زنا اور اغلام عوامی نعرہ بن جائے تو اسے جائز قرار دیدیا جائے اسلام کے اصول اور قران پاک کے احکامات جو ہمارے اخلاقی نظام واقدار کی بنیاد ہیں حقانیت وآفاقیت کے علمبردار ہیں اور ناقابل تغیر ہیں۔

ایمان

اپنے بسیط تر مفہوم میں ایمان کے معنی اسلامی معتقدات، اخلاق اور اقدار کو اپنی صداقت قلب کے ساتھ یعنی ''نیت احساس اور قول فعل کے حوالے'' سے درست تسلیم کر کے اپنانے اور اپنی زندگیوں پر نافذ کرنے کے ہیں۔ کم عمر نو بالغ اسلام کے پورے اخلاقی نظام کو بصیرت کے ساتھ اپنانے اور سمجھنے کی صلاحیت تو نہیں رکھتا مگر بڑوں کی قوت ''ایما'' کے ذریعہ اس میں ایماپذیری قبولیت اور تسلیم کا جو جوہر پیدا ہوتا ہے اس کے سہارے اسے تسلیم کا خوگر بنانے کے ساتھ ساتھ اس کے ذوق تفہیم کی تسکین بھی کرنی چاہیئے یعنی ماں باپ نوعمر کو ماننے کا عادی بنائیں تو قدرت جاننے کی صلاحیت بھی عطا کر دیتی ہے قران حکیم کے مطابق ''ہدایت اسی کے لیئے ہے جو غیب پر ایمان لایا جیسا کہ میں نے کہیں لکھا ہے کہ دلیل سے اللہ کو ماننے والا اللہ پر نہیں دلیل پر ایمان لاتا ہے میرا تصور تو یہ ہے کہ

میں نے اس سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے پر
ایک نادیدہ حقیقت کو خدا مان لیا
اور کونین کی تخلیق کا مقصد کیا ہے
میں نے اس رمزِ حقیقت کو بھی پہچان لیا
نقشِ پائے شہ کونین پہ چلنا سیکھو
روشنی سے جو محبت ہے تو جلنا سیکھو

درج بالا تفصیلات سے قطع نظر قرانی احکام کی رو سے درج ذیل پر ایمان لانا ضروری ہے۔

☆ اللہ یعنی توحید کو حسب تصور قرانی تسلیم کرنا۔

☆ اللہ کے فرشتوں کو جیسا بتایا گیا تسلیم کرنا۔

☆ آسمانی کتابوں کو برحق تسلیم کرنا

☆ رسولوں کو برحق ماننا

☆ یوم آخرت پر یقین رکھنا (اور تقدیر پر)

یہ اجزائے ایمانی قران پاک میں اسی ترتیب سے بیان کیئے گئے ہیں کہ وحی بھیجنے والا اللہ ہے...... وحی لانے والا فرشتہ ہے...... وحی جس شکل میں آئی ہے وہ کتاب ہے...... وحی جس پر آئی ہے وہ رسول ہے...... اور وحی میں جو اہم خبر دی گئی ہے وہ یوم الآخرت ہے۔

یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ اللہ کو ماننے کے معنی اس کی لاشریک ذات کو جملہ سلبی وایجابی صفات کے ساتھ ماننا ہے جو قران وحدیث سے ثابت ہیں۔ فرشتوں کو تابع حکم ایسی مخلوق تسلیم کرنا جن سے سہو نہیں ہوتی۔ کتب میں وہ سب کچھ شامل ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے والوں پر نازل کیا گیا خواہ ہمیں اس کا علم ہو کہ نہ ہو مگر تسلیم کرنا ضروری ہے اوران تمام رسولوں پر بھی ایمان لانا ہے جو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے گذرے ہیں نیز یہ کہ ''یوم آخر'' مرکر دوبارہ زندہ کیے جانے پر حساب کتاب پر (اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت پر بھی) ایمان رکھنا ضروری ہے۔

یہ وہ اہم ایمانی عوامل ہیں جن پر طفلی میں صغیر سنی میں اور نو بلوغ پر پہنچنے تک کامل یقین پیدا کرانا ضروری ہے۔ یہی اسلام کا پہلا سبق ہے ساتھ ہی کم سن کی استعداد کی حد تک پختگی عقائد کے لیئے دلائل سے آشنا کرنا بھی مناسب ہے۔ دلیل ایمان لانے کے لیئے نہیں بلکہ عقیدے کو محکم کرنے کے لیئے زیادہ اہم ہے۔

اقدار کی درجہ بندی

بیان کردہ اجزائے ایمان کی شرح و تفہیم کے علاوہ نوعمری میں ہی اسلامی اقدار کی درجہ بندی کا تصور بھی دینا ضروری جو حسب ذیل ہے قدریں بنیادی طور سے دو ہیں۔ نمبر ۱ مثبت، نمبر ۲ منفی

ا۔ اوامر (امر) مثبت قدریں

ب۔ منہیات (نہی) منفی قدریں

ا۔ اوامر:

اوامر سے مراد وہ احکامات ہیں جن کے کرنے کا حکم ہے ان میں

نمبر ۱۔ فرائض نمبر ۲۔ سُنن نمبر ۳۔ مستحبات

فرائض وہ اعمال ہیں جن کے ترک یا انقطع کی ہرگز اجازت نہیں ہے۔

☆ فرائض:

۱۔ صلوٰۃ ۲۔ صوم ۳۔ حج ۴۔ زکوٰۃ ۵۔ جہاد

☆ سُنن:

وہ جو کچھ قران پاک میں بطور واضح حکم نہیں ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یا تو وہ عمل خود کیا ہے یا امت کے لیئے لازم کیا ہے۔ سنن کی دو اقسام ہیں۔

(الف) وہ جنکی تاکید کی گئی ہو وہ سنن موکدہ ہیں۔

(ب) وہ جنہیں کہا یا کیا گیا ہو مگر امت کو تاکید نہ کی گئی ہو۔ غیر موکدہ ہیں

☆ مستحبات:

یہ وہ اعمال ہیں جو نہ فرض ہیں نہ سنت مگر وہ اعمال صالح ہیں جو سرکار نے انجام دیئے یا جن کی ترغیب دی۔

ب۔ منہیّات:

یہ وہ کام ہیں جو اوامر کے برخلاف ہیں یعنی ان کا نہ کرنا لازم ہے ان میں اہم ترین ہیں۔ نمبر ۱۔ جھوٹ، نمبر ۲۔ چوری، نمبر ۳۔ زنا (بشمول اغلام)، نمبر ۴۔ سود نمبر ۵۔ نشہ یا شراب نوشی۔ نمبر ۶ غیبت۔ ان کے نہ کرنے کی سخت تاکید ہے اور ان سے کمتر درجہ کے ممنوعات میں مکروہات ہیں۔ یہ وہ افعال ہیں جو فرد کی ذاتی پسند کے خلاف ہیں اگر کرے تو گناہ نہیں مگر نہ کرنا افضل ہے۔

سطور بالا میں اسلام کے احکامات و اقدار کی ایک سرسری جھلک پیش کرنے

کی کوشش کی گئی ہے جس میں بعض دیگر پہلوں کا بھی اضافہ کیا جا سکتا ہے مگر نو بلوغ کی منزل تک فرد کو ان اقدار سے آشنا کرنا ضروری ہے جو تکمیل ایمان کا لازمہ ہیں۔ اسلامی اخلاق کی اقدار کے تعین کے بعد دوسرا اہم عنوان یا جز وایمان حقوق فرائض کا تعین اور ادائیگی ہے۔

حقوق وفرائض

ایک با ایمان مسلم یا مسلمہ پر دوسروں کی طرف سے یا دوسروں پر اس کی طرف سے جو ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں انہیں اصطلاحاً حقوق وفرائض کہتے ہیں۔

حقوق حق کی اور فرائض فرض کی جمع ہے سماجی زندگی جو دوسرے افراد کے ساتھ باہم اشتراک تعاون سے بسر کی جاتی ہے وہ فرد کے اوپر دوسروں کی طرف سے بعض ذمہ داریاں لازم کرتی ہے جنہیں ''فرائض'' کہتے ہیں اور بعض ذمہ داریاں فرد کی طرف سے دوسرون پر عاید کرتی ہے جنہیں ''حقوق'' کہا جاتا ہے ان ہی حقوق وفرائض کی انجام دہی کی کوشش میں وقوع پذیر ہونے والے عمل کو ''مطابقی کردار'' کہتے ہیں یہ کردار ہی نفسیات کا موضوع مطالعہ ہے اسلامی اخلاقی نظام میں فرد پر عاید کیئے جانے والے یعنی دوسروں کے حقوق حسب ذیل تین جگہ تقسیم کیئے جاتے ہیں۔

ا۔ حقوق اللہ ب۔ حقوق العباد ج۔ حقوق النفس

ا۔ حقوق اللہ

حقوق اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کے وہ حقوق ہیں جو بحیثیت عبد ''انسان'' پر عائد ہوتے ہیں ان میں کوئی دوسری مخلوق حائل نہں یہ خالص اللہ اور بندے کے

درمیان معاملہ ہے جن کے لیئے بندے کو روز حشر جواب دینا ہے اللہ کے حقوق کی اہم شکلیں وہ عبادات ہیں جو خالص اللہ کے لیئے ہیں مثلاً نماز، روزہ، حج اور جہاد وغیرہ دیگر فرائض میں زکوۃ بندوں کا حق ہے۔ تقویٰ اللہ کے لیئے ہے۔

ب۔ حقوق العباد:

حقوق العباد کی اسلام میں حقوق اللہ سے کم اہمیت نہیں کہ یہ ''بندگان خدا'' کے حقوق ہیں جنہیں کسی بھی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہر صاحب حقوق کو اپنا حق معاف کرنے کا اختیار ہے پھر اللہ تو سب سے بڑا اختیار والا ہے وہ ''ستار و غفّار'' بھی ہے وہ اپنے حقوق ادا نہ ہونے پر سزا کو معاف کر سکتا ہے مگر حقوق العباد غصب کرنا قابل معافی نہیں ہے۔ حقوق العباد کی اہم شکلیں حسب ذیل ہیں۔

ا۔ حقوق والدین، ۲۔ حقوق اولاد، ۳۔ حقوق زوجین، ۴۔ حقوق یتامیٰ ومساکین ومسافرین، ۵۔ حقوق اساتذہ وغیرہ۔

معاشرے کی تنظیم اور خوشگوار سماجی زندگی گذارنے کے لیئے ان حقوق کا ادا کرنا ضروری ہے جو فرد کے سماجی فرائض تصور کیئے جاتے ہیں۔

ج۔ حقوق النفس

خود اپنے اوپر اپنے حقوق ہیں حقوق النفس کا تصور اسلام کا طرۂ امتیاز ہے جو فرد کو رہبانیت اور ترک دنیا سے بچاتا ہے ان کا رمز یہ ہے کہ اگر فرد اپنے حقوق ادا نہیں کرے گا تو نہ تو حقوق اللہ ادا کرنے کے لائق رہے گا اور نہ حقوق العباد۔ ان حقوق میں سب سے پہلا حق اپنی زندگی کو تحفظ دینا ہے یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظام اخلاق میں ''خودکشی'' سب سے بڑا ناقابل معافی جرم ہے جس کا ارتکاب کرنے

والا فرد ''ابدالآباد'' تک جہنمی ہے۔ قتل سے تو ''خوں بہا'' کے ذریعہ نجات ہوسکتی ہے مگر خودکشی کی سزا سے معافی نہیں ہے یہاں ایک نازک بات ذہین نشین کرنی ضروری ہے وہ یہ کہ اسلام میں ''نفس کشی'' جائز ہے ''خودکشی'' ناجائز اس لیئے کہ ریاضت اور مجاہدے کا دباؤ ''نفس امارہ'' پر پڑتا ہے جو بدی کا حکم دینے والا ہے۔ جبکہ خودکشی میں ''نفس ناطقہ'' قتل ہوجاتا ہے۔ اور پھر یہ کہ اولیاء واصفیا کے کام اور واجبات ''نفس'' پر لازم نہیں آتے اسے اپنی بقا اور پرورش کے لیئے معتدل کھانے پینے، رہنے سہنے، سونے جاگنے، دوا علاج اور دیگر ضروریات زندگی کی تکمیل کے لیئے سعی وعمل کی اجازت ہے مگر یہ اس حد تک کہ ''نفس'' بے لگام اور باغی نہ ہوجائے اس کے لیئے بعض ایسے کرداری نمونے اختیار کرنے پڑتے ہیں جو مختلف نفسیاتی مطابقی کردار کے آئینہ دار ہیں ان کی تفصیلات اگلے باب میں ''نفسیاتی مطابقت کے کرداری نمونوں'' کے زیرعنوان پیش کی جائیگی۔ فی الحال نوعمری سے متعلق عہد کی تین خصوصیات اجمالاً بیان کی جارہی ہیں۔

تنقید کا شعور

نوعمر کے عہد میں بلوغ کے قریب پہنچنے والے فرد کو خواہ وہ مرد ہو یا عورت اپنے کردار کی ''بازتشکیل'' (Reconstruction) کرنی پڑتی ہے۔ یعنی وہ جو کچھ طفلی میں کرتا رہا ہے اس میں کوئی انقلابی تبدیلی تو نہیں ہوتی مگر ارتقائی یا نشائی تبدیلی ضروری ہوتی ہے۔ کھانا پینا۔ لباس پوشاک۔ گفتگو پرانے خطوط پر ہی قائم رہتی ہے مگر ہر چیز کے کچھ نئے معنی سمجھ میں آنے لگتے ہیں۔ یعنی تسلیم میں تفہیم کا عنصر بھی جلوہ گر ہوتا ہے۔ اور ''فہم وشعور'' کے دخل کا اثر یہ ہوتا ہے کہ فرد خود بھی اپنے معمولات سے متعلق ایک ''رائے'' رکھنا شروع کرتا ہے۔ یعنی اس کے عمل

میں اس کی مرضی کی بھی شمولیت ہونے لگتی ہے جس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ اس میں ''رائے'' کے حوالے سے ایک ''تنقیدی شعور'' پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے جو ابتدا میں کمزور رہتا ہے مگر مآل کار مستحکم ہو جاتا ہے اسی لیئے فرد میں سیکھے ہوئے اعمال میں ترمیم و اصلاح کے امکانات بڑھ جاتے ہیں جن پر اگر نوعمر کی بصیرت افروز رہنمائی نہ کی جائے تو وہ اخلاقی پستی کی راہ بھی اختیار کر سکتا ہے اس خرابی کی پیش بندی کے لیئے اسلامی اداب و معمولات کے حوالے اس میں اسلامی ''موانع'' (Donts) کا شعور پیدا کرنا ضروری ہے۔

آرزوئیں اور مستقبل

بیان کردہ ''شعوری جگار'' یعنی بیداری کے ساتھ نئی نئی پیدا ہونے والی آرزوئیں بھی بے حساب موجود ہوتی ہیں۔اب ان آرزوں اور معروضی حالات کے ارتباط میں ایک جانب تو حقیقت پسندی پیدا ہوتی ہے اور دوسری جانب بعض حوالوں سے اس کی نظر موجود یعنی حال سے آگے بڑھ کر مستقبل کی نشاندہی کرتی ہے۔

غرض میری سنیئے جواں جب میں ہونگا
اگر ہوسکا تو معالج بنوں گا
میں رکھونگا تن پر پلستر کسی کے
بدن پر لگاؤنگا نشتر کسی کے
کہیں کام لونگا دوا و غذا سے
کہیں صرف تبدیل آب و ہوا سے
غرض میری سنیئے جواں جب میں ہونگا......

ایسی آرزوئیں نوعمری کا خاصہ اور اپنے ذوق و میلانات اور سماجی اکتساب کی آئینہ دار ہوتی ہیں جن کا فیصلہ آنے والے حالت کرتے ہیں

یہ بات الگ ٹھہری کہ تعمیر نہ ہوں
ہر ذہن میں کچھ تاج محل ہوتے ہیں

''یہ ذہنی تاج محل'' ہی فرد میں ''تحریک و سعی'' پیدا کر کے فرد کے عمل و کردار کی راہ ہموار کرتے ہیں

تحریک و مطابقت

درج بالا حوالوں سے فرد میں جو تحریک پیدا ہوتی ہے اس کی بنیاد پر ہی فرد سعی کرتا ہے اور جس فعل کی انجام دہی سے تسکین ہوتی ہے اسے جاری رکھتا ہے اور جس کام میں شکست ہوتی ہے اسے جاری نہیں رکھتا ترک کر دیتا ہے اس طرح سعی و خطا کے عمل سے آموزش کا سلسلہ ''تحریک و تقویت'' (Motivation & Reinforcement) کے سہارے آگے بڑھتا رہتا ہے یہاں والدین اور اساتذہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ اسے ''سعی و خطا'' کا پتلا بننے سے روکیں بلکہ اسمیں ''بصیرت اسلامی'' اور ''تقلید و اتباع بزرگان'' کا شعور بھی بیدار کریں کہ نفسیاتی لحاظ سے آموزش کے تین ہی بڑے طریقے ہیں۔

ا۔ سعی وخطا (Trial & Error)

ب۔ بصیرت (Insight)

ج۔ تقلید (Immitation)

مندرجہ بالا آموزشی طریقوں کی مزید تفصّل نفسیاتی تکنیکی مباحث میں مبتلا کردے گی اس لیئے گفتگو کو یہیں پر ختم کیا جاتا ہے اور آخری عنوان کے طور پر چند اہم اوراد کا تذکرہ ہے۔

چند اوراد:

زیر نظر عنوان نوعمری کے لیئے مختص نہیں ہے مگر اس سے تعلق خاص رکھتا ہے۔ ''اوراد''، ورد کی جمع ہے، ورد کے معنی تو ''ہر روز کا کام'' ہے مگر اس میں حوالہ خصوصی قول یا بیان کا ہے۔ یعنی کسی کلام کے روزانہ دوھرانے کو ورد کہتے ہیں یہ بات مسلّمہ ہے کہ باطنی اور سماجی ہر دو لحاظ سے بعض کلمات کا دوھراتے رہنا ایک تاثیر ضرور رکھتا ہے۔ الفاظ کو معنی و مفہوم سمجھ کر دوھرانا ''بیان محض'' سے افضل ہے کسی قول، کلام یا آیت کے ورد کا فرد کو عادی بنانے کے لیئے ''نوعمری کا عہد'' بہترین ہے کہ اس عہد میں قائم ہو جانے والے کرداری نمونے یا ''اوراد'' ہمیشہ کے لیئے مستحکم ہو جاتے ہیں۔ فرد کے صراط مستقیم پر قائم رہنے اور اس کی برکات حاصل کرنے کے لیئے درج ذیل ''چار اوراد'' اہم ترین ہیں۔

ا۔ کلمہءِ طیّبہ:

ہر بیان سے افضل سب سے بڑی حقیقت اور ایمان کی بنیاد جنّتی ہونے کی بشارت کلمہءِ طیبہ سب سے مبارک اور ''اہم ترین ورد'' ہے جس میں اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کے معبود نہ ہونے کا اقرار اور محمد ﷺ کے رسول ہونے پر ایمان کا اعلان ہے۔ صبح اٹھ کر سب سے پہلے پڑھنا چاہیئے۔

لَآ اِلٰــہَ اِلَّا اللّٰــہُ مُـحَـمَّـدٌ رَّسُـوْلُ اللّٰــہِ

اس کے پڑھنے سے بندہ شرک وگمراہی سے نکل کر اسلام میں داخل ہوجاتا ہے اور اس کے لیئے رسول اکرم ﷺ کا فرمان ہے کہ جس نے ایک بار (یعنی ہمیشہ کے لیئے) لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہا وہ جنتی ہے۔

۲۔ لاحول:

یہ دوسرا اہم ترین ورد ہے کہ اس سے شیطان بھاگتا ہے اور اس کی تمام چالیں ناکام ہوجاتی ہیں ارشاد ہے کہ ''وہ (شیطان) تمہارا کھلا دشمن ہے تو اس دشمن سے بچنے اور اسے بھگانے کے لیئے اہم ترین ذریعہ ''لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ ہے کہ اس کے آگے شیطان ٹھہر ہی نہیں سکتا۔

۳۔ استغفار:

اگر انسان سے چوک ہوجائے اور لاحول سے غافل ہو کر شیطان کے بہکائے میں آ کر گناہ کر بیٹھے تو اس کے لیئے ''اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْهِ'' کہ اس کی برکت سے بندے کا گناہ معاف ہوجائے اور وہ پھر سلامتی کی راہ پر آ جائے (اور جب لباس پاک ہوجائے تو خوشبو لگائے)

۴۔ درود شریف:

یہ وہ عمل ہے جو اللہ اور اس کے فرشتے بھی کرتے ہیں اور مومنوں کو بھی حکم ہے کہ تم بھی نبی ﷺ پر صلوٰۃ وسلام بھیجو۔ صلوٰۃ بھیجنے کا بہترین طریقہ حضور اکرم کے ارشاد پاک کے مطابق درود ابراہیمی ہے جس کے بغیر نماز مکمل نہیں ہوتی (بعض بزرگان نے درود تاج شریف کے ورد کی تاکید کی ہے جس کی برکات و

فیض کا راقم بھی گواہ ہے) ویسے لفظ صلوٰۃ قران پاک کی ایک اہم پر مغز اصطلاح ہے کہ ''جب اللہ اور اس کے فرشتوں کی طرف سے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیئے ہے تو درود ہے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت سے اللہ کے لیئے ہے تو نماز ہے'' قران پاک صلوٰۃ کے نظام کو قائم کرنے کا حکم دیتا ہے۔

درود شریف کے بغیر نماز بھی مکمل نہیں ہوتی

تیسرا باب

بلوغ کے اسلامی آداب و معمولات

نفسیاتی مطابقت...... زندگی کا بھرپور وقوف...... یقین آخرت......اسلامی کرداری نمونے......**(۱)رجوع باللّٰہ کرداری نمونے**......شکر......توبہ......دعاء......رضا......
(۲)رجوع بالنفس کرداری نمونے......مجاہدہ......صبر......توکل......فقر......تقویٰ......حق گوئی......ایفائے عہد......
پابندیٔ اوقات......**(۳)رجوع بالعباد کرداری نمونے**......عدل واحسان......عفوو ایثار......جودوسخا......خوش خلقی......خیر خواہی......صلہ رحمی......

نفسیاتی مطابقت

بچہ کی پیدائش سے بوڑھے کی موت تک انسانی زندگی میں دو خصوصیات نظر آتی ہیں اول تبدّل دوم تسلسل۔

☆ فرد جو کچھ آج ہے کل نہیں تھا......تبدّل

☆ فرد وہی ہے جو کل بچہ تھا......تسلسل

اس کے معنی یہ ہوئے کہ زندگی ایک مسلسل تغیر ہے۔ حمل۔ ولادت۔ رضاعت۔ اوائل طفلی۔ آواخر طفلی۔ نوعمری۔ نو بلوغ۔ بلوغ۔ کہولت اور ضعیفی تمام مدارج ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن ہر درجۂ عمر پر فرد کا کام ہمہ وقت رونما ہونے والی تبدیلیوں سے مطابقت (Adjustment) کرنا......متوازن رہنا......توازن (Equilibrium) قائم رکھنا ہے......تبدیلیاں کہاں پیدا ہو رہی ہیں فرد کے اندر بھی اور باہر بھی (Implicit & Explicit)......اندرونی یا بیرونی ماحول کا تغیر (Stimulation) (تہیج) فرد اور ماحول کے درمیان قائم شدہ توازن کو بگاڑ رہا ہے فرد اسی توازن کو بحال کرنے (Readjust) اور ہم آہنگی برقرار رکھنے کے لیئے کچھ کر رہا ہے۔ ''یہی نفسیاتی مطابقت ہے'' یہ کیسے پیدا ہو رہی ہے کردار کے ذریعہ چنانچہ یہی کردار مطابقتی کردار (Adjustive Behaviour) ہے جو نفسیات کا موضوع بحث ہے۔

☆ اگر دوسروں کے لیئے قابلِ مشاہدہ ہے تو اسے خارجی کردار (External Behaviour) کہینگے۔

☆ اگر صرف اپنے لیئے ہی قابل مشاہدہ ہے تو یہ داخلی کردار ہے دور قدیم میں اس داخلی کردار کے لیئے ہی ''ذہن'' کی اصطلاح استعمال ہوتی تھی (Internal Behviour)

ان دونوں کرداری نمونوں کے تعلق کو یوں سمجھے کہ جیسے بولنے اور سوچنے میں جو رشتہ ہے وہ داخل و خارج کے تعلق کو واضح کر دیتا ہے کہ ''بغیر آواز کے بولنا سوچنا ہے اور با آواز بلند سوچنا بولنا ہے'' نفسیاتی ماہیت دونوں کی ایک ہے۔

اسلام کے اخلاقی نظام میں داخلی کردار کو ''نیت'' اور خارجی کردار کو ''عمل کہتے ہیں'' سرکار ﷺ کی حدیث شریف ہے کہ عمل نیت سے ہے چنانچہ صحت مند نفسیاتی مطابقت کے معنی داخل و خارج اور نیت و عمل کی ہم آہنگی ہے اور ان کا تضاد بالعموم منافقت ہے سوائے اس کے کہ نیت نیک اور عمل خراب ہو جائے جیسے حضرت موسیٰ کا بندے کو تھپڑ مار کر قتل کر دینا یا بعض فقراء کا عمل ظاہر خراب ہونا۔ منصور کا انالحق کہنا۔ سرمد کا پابند شرع نہ ہونا دراصل یہ اعمال غلط نہیں مگر ''شریعت ظاہر ہے'' سزا عمل پر ہے نیت پر نہیں ''مگر جزا نیت پر بھی ہے''۔

شریعت مطاہرہ میں ''اسلامی کرداری نمونے'' (Islamic Behaviour Patterns) وہی اعمال ہیں جو معیار ظاہرہ میں اسلامی اخلاق و اقدار سے ہم آہنگ ہوں اور حقیقی خیر وہ ہے جو ظاہر میں اسلامی اقدار کے مطابق اور باطن میں نیت سے ہم آہنگ ہو۔ ظاہر و باطن کی اس صداقت کے ساتھ ہی زندگی کا بھرپور وقوف ممکن ہے۔

زندگی کا بھرپور وقوف

انسانی ذہن کی محدودیت کو کیا کہیے کہ وہ ''مشہود کو ہی موجود جانتا ہے'' حالانکہ سائنسی تحقیقات ثابت کررہی ہیں کہ ہر وجود کے لیئے قابل مشاہدہ ہونا ضروری نہیں کتنی روشنیاں ہیں جو ہم دیکھ نہیں سکتے؟ کتنی آوازیں ہیں جو ہم سن نہیں سکتے؟ کتنے جرثومے بیکٹر یا اور وائرس ہیں جو بغیر خوردبین دکھائی نہیں دیتے۔ جنات اور خبائث نظر نہیں آتے شیاطین دکھائی نہیں دیتے جبکہ ان کے ہونے کے ثبوت موجود ہیں انسان کے حواس کے روبرو دنیا کتنی محدود ہے۔ اس کا مشاہدہ صرف ولادت سے وفات تک ہے اس سے پہلے کیا تھا۔ اس کے بعد کیا ہے؟ کتنے لوگ ہیں جو ان حقائق کا ادراک رکھتے ہیں انسان کی ''جزو بینی''...... اس کی نظر کا ''خوگر پیکر محسوس ہونا'' اس کی مجبوری ہے جس کے سبب وہ حیات بعد الموت کے رموز سے نہ آشنا ہے انسان کے اس فہم ناقص کو عقیدہ آخرت سے جو جلا ملتی ہے وہ اس کی سوچ اور عمل میں اصلاح کر کے زندگی سے متعلق اس کے کرداری نمونے کو جو شکل دیتی ہے وہ ''اسلامی کرداری نمونہ'' ہے جو پورے معاشرے سے مطابقت کے عمل کو معتبر اور صحت مند بنا دیتا ہے۔

یقین آخرت

جس کے پاس زندگی کا بھرپور تصور نہیں وہ زندگی کی کامیابی کا کسطرح تصور کرسکتا ہے۔ عقیدہ آخرت ایک وقوفی عمل ہونے کے علاوہ ایک ایسی تحریکی قوت بھی ہے جس کے زیر اثر روبہ عمل آنے والے ہر کرداری نمونے کو اسلامی کرداری مطابقت کا نمونہ کہا جاسکتا ہے قران پاک نے اللہ رسول فرشتوں اور کتابوں پر ایمان لانے کے ساتھ ''یومِ آخرت پر ایمان لانے کو شرط ایمان بنا دیا

ہے کہ اس عقیدے کے بغیر نہ اسلام رہتا ہے نہ ایمان ہماری بد قسمی یہ ہے کہ فی زمانہ یہ عقیدہ اتنا قوی اور زندگیوں میں رچا بسا نہیں ہے جو بزرگان سلف میں تھا یہی وجہ ہے کہ اس عقیدے کی کمزوری یا اس کی طرف سے غفلت ہمیں شیطانی دنیاداری میں ملوث و منہمک کئے ہوئے ہے اور ہمیں احساس اور اندازہ بھی نہیں ہے کہ ''عقیدۂ آخرت'' کے احساس سے دوری ہمارے نیت و اعمال کے نظام کو کس قدر تباہ کر رہی ہے۔ راقم کے نزدیک فرد کا ہر وہ عمل جو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کئے جانے اور بارگاہِ ربی میں جواب دینے اور رسول اکرم ﷺ کی شفاعت کی امید سے مزّین ہے وہ اسلامی کردار ہے جو بحیثیت ایک مسلمان ہمارے اعمال و نیت کو اسلام کے سانچے میں ڈھالتا ہے چنانچہ عقیدۂ آخرت کی تحریکی قوت کے بل پر وقوع پذیر ہونے والا کردار اس نفسیاتی مطابقت کا ضامن ہے جو اسلامی اخلاق و اقدار سے ہم آہنگ ہے ہم اسلام کے مطابقتی کرداری نمونوں کو درج ذیل اقسام میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

اسلامی کرداری نمونے

سطور بالا میں بیان کردہ تصورات کی بنیاد پر ہم اسلامی کرداری نمونوں کو تین جگہ تقسیم کر سکتے ہیں۔

ا۔ رجوع باللہ کرداری نمونے

(God Oriented Behaviour Pattens)

یہ فرد کے وہ داخلی و خارجی کرداری نمونے اور اعمال ہیں جن میں روز حساب پر یقین رکھتے ہوئے فرد اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے یہ اللہ اور بندے کے درمیان

کے معاملے اور ایسے کرداری نمونے ہیں جو اللہ اور بندے کے درمیان ہیں۔

☆ شکر ☆ توبہ۔استغفار

☆ دعا ☆ رضا

۲۔رجوع بالنفس کرداری نمونے

(Self-Oriented Behaviour Pattens)

یہ اعمال کرداری مطابقت کے وہ اسلامی نمونے ہیں جن کا رخ فرد کی اپنی ذات کی جانب ہوتا ہے اور ان کا مقصد اپنے نفسیاتی تقاضوں کو اسلامی قدروں سے ہم آہنگ کرنا اور اصلاح ذات ہے ان کے اہم نمونے حسب ذیل ہیں۔

☆ صبر ☆ مجاہدہ ☆ توکل

☆ فقر ☆ تقویٰ ☆ حق گوئی

☆ ایفائے عہد ☆ پابندی اوقات

۳۔رجوع بالعباد کرداری نمونے

(People Oriented Behaviour Pattens)

یہ وہ مطابقی کرداری نمونے ہیں جن میں فرد کا رخ اللہ کی طرف یا اپنی ذات کی طرف نہیں ہوتا بلکہ اللہ کے نام پر اس کے بندوں کی طرف ہوتا ہے جن پر سماجی معاملت کا یعنی دوسروں کے ساتھ برتاؤ کا تصور حاوی ہے ان کی درج ذیل اہم اشکال ہیں۔

☆ عدل واحسان ☆ عفو وایثار ☆ جود وسخا

☆ خیر خواہی ☆ خوش خلقی ☆ صلہ رحمی

اوپر بیان کردہ اسلامی کرداری نمونوں کی کچھ ضروری تفصیلات ذیل میں پیش کی جارہی ہیں تشریح اوپر بیان کردہ ترتیب کے لحاظ سے ہے۔

شُکر

رجوع باللہ کرداری نمونوں میں شکر ایک اہم اسلامی کردار ہے۔ لفظی معنی تو ''دینے والے کی تعریف کرنا یا احسان ماننے کے ہیں'' اور اس کے لیئے جو کردار انجام دیا جائے وہ شکرانہ ہے اس کائنات میں کسی بھی انسان کے پاس جو کچھ ہے وہ اس کا اپنا نہیں ہے ''عطیۂ خداوندی'' ہے چنانچہ اپنے زیر تصرف ہر شے کے لیئے عطا کردہ اعزاز و شرف کے لیئے نہ صرف یہ بلکہ پورے حال احوال کے لیئے اللہ کا احسان ماننا اور اس کی تعریف کرنا شکر ہے۔ شکر زبانی کردار بھی ہے اور عملی بھی ''اے اللہ تیرا شکر ہے ان تمام نعمتوں کے لیئے جو تو نے مجھے عطا فرمائیں'' زبانی شکرانہ ہے۔ ادائے شکر کے لیئے نوافل ادا کرنا۔ کسی کو کھانا کھلانا یا کسی کی حاجت روائی کرنا سب ''عمل شکر'' کی تعریف میں آتے ہیں۔ ایک مسلمان کو درج ذیل کے لیئے جس قدر بھی ممکن ہو اللہ کا شکر ادا کرتے رہنا چاہیئے۔

- ☆ اس نے ہمیں اشرف المخلوق بنایا
- ☆ اس نے امت محمدیؐ میں پیدا کیا یا اس میں شمولیت کی توفیق دی
- ☆ اس نے ہمیں گھر بار۔ عزت آبرو۔ بیوی بچے اور ذہنی و جسمانی صحت عطا کی (جتنا اور جب چاہا)
- ☆ اس نے ہمیں بہت سی ایسی صفات اور صلاحتیں عطا کیں جو ہم خود حاصل نہیں کر سکتے ہیں۔

مندرجہ بالا عنوانات کے علاوہ ہر فرد کی زندگی میں کچھ ایسے امتیازات ہوتے ہیں جو اس کا حصہ ہیں اور بہت ایسی صلاحیتیں ہیں (حِس فہم ادراک۔ عقل۔ حوصلہ) جن کا ہمیں عام زندگی میں شعور بھی نہیں ہوتا۔ مولانا محمد رشید عثمانی کی تالیف کردہ ''لغات قران'' میں جو چھ جلدوں پر مشتمل ہے ''شکر'' کی شرح میں درج ذیل پانچ عوامل بیان کیئے گئے ہیں۔

☆ شاکر کی مشکور کے لیئے فروتنی

☆ مشکور سے محبت

☆ مشکور کی عطا کردہ نعمتوں کا اعتراف

☆ مشکور کی عطا کردہ نعمت کے لیئے اس کی ثناء

☆ نعمت کا ایسا استعمال جسے معطی پسند کرے

اوپر بیان کردہ عوامل پر مشتمل اگر بندے کا احساس عمل میں ڈھل سکے تو اس کی شخصیت میں بے حساب ایسی خصوصیات پیدا ہوسکتی ہیں جو بالواسطہ فرد اور معاشرے کے باہم رشتہ کی بنیاد بن کر بہترین معاشرے کی تخلیق میں اہم کردار ادا کرسکتی ہیں۔ یہ کرداری نمونہ بظاہر تو رجوع باللہ کا ایک زاویہ ہے مگر اس میں اجتماعی خیر کا جوہر بھی موجود ہے۔

محمد عبدالحمید صدیقی کی توشۂ آخرت جو پانچ جلدوں پر مشتمل ہے جلد سوم میں قرآنی حوالوں سے شکر کا بیان ہے جس میں انہوں نے قرآن پاک کی ۲۶ ایسی آیات تحریر فرمائی ہیں جن میں شکر گزار بننے کی ہدایت اور شکر کرنے والوں میں شامل ہونے کی دعوت ہے ان حوالہ جات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام

کے اخلاقی نظام میں شکر کے کردار یا تشکر کی کتنی اہمیت ہے اور اس کے مثبت اثرات شخصیت کی تعمیر میں کتنے گہرے نقوش قائم کرتے ہیں اے اللہ ہمیں شکر کی توفیق عطا فرما۔

استغفار و توبہ

رجو باللہ کرداری نمونوں میں دوسرا بڑا اور اہم کردار توبہ واستغفار ہے یہ دو الفاظ ہیں جو بالعموم ساتھ ساتھ استعمال ہوتے ہیں۔ قران حکیم میں بھی ہے اَسۡتَغۡفِرُ اللّٰہُ رَبِّیۡ مِنۡ کُلِّ ذَنۡبٍ وَّاَتُوۡبُ اِلَیۡہِ۔ یہاں استغفار کے معنی گناہ ترک کر کے اس کی معافی مانگنا ہے یا مغفرت طلب کرنا ہے اور توبہ کے معنی واپس لوٹنا ہے کہ بندہ ارتکاب گناہ کے ذریعہ جو راہ رراست سے بھٹک گیا تھا وہ پھر اس پر لوٹتا ہے یا اللہ سے رجوع کرتا ہے۔

غور فرمائیے کہ شیطان نے آدم کو سجدہ نہ کر کے گناہ کیا اور آدم نے ''شجر ممنوعہ'' (گندم کھا کر) سے دور نہ رہ کر گناہ کیا۔ گنہگار دونوں ہیں مگر جو اپنے گناہ پر نادم ہوا اور جس نے مغفرت طلب کی اسے زمین پر خلیفۃ اللہ بنا دیا گیا اور جس نے توبہ کے بجائے عذر گناہ پیش کیا اسے ''مردود'' کر دیا گیا۔ قران حکیم میں بار بار مختلف طریقوں سے استغفار و توبہ کی تلقین کی گئی ہے۔ حدیث شریف ہے کہ جس نے ''اَسۡتَغۡفِرُ اللّٰہُ الَّذِیۡ ھُوَ الۡحَیُّ الۡقَیُّوۡمُ وَاَتُوۡبُ اِلَیۡہِ'' پڑھا اس کے تمام گناہ بخش دیئے گئے خواہ وہ میدان جہاد سے ہی کیوں نہ بھاگا ہو۔ (ابوداؤد)

ویسے تو گناہ چھوٹا ہو کہ بڑا ''گناہ گناہ ہے'' مگر اپنی معاشرتی اہمیت کے لحاظ سے وہ گناہ چھوٹے ہیں جن میں فرد کی ایسی نجی زندگی کا حوالہ ہو جو اس کی

ذات تک محدود رہے یا بندے اور اللہ کے درمیان کہ دوسرے اس سے متاثر نہ ہوں مگر وہ گناہ جو معاشرتی حوالہ رکھتے ہوں یا ان میں دوسروں کے لیئے ترغیب گناہ ہو بڑے گناہ ہیں ایسا ہی ایک بڑا سماجی اور اخلاقی گناہ میدان جہاد ہے منہ موڑ کر میدان چھوڑ نا ہے مگر ''توبہ واستغفار'' کی برکت پر غور کیجئے کہ اس کے ذریعہ وہ گناہ بھی معاف ہو جاتا ہے مومن کے گناہ اور کافر کے گناہ میں فرق یہ ہے کہ یہ گناہ ایمان کے پس منظر میں ہوتا ہے اور وہ بے ایمانی یا گمراہی کے حوالے سے صاحب ایمان برے کو برا سمجھتا ہے خواہ وہ اس کا اپنا ہی عمل کیوں نہ ہو مگر بے ایمان گنہ کو برا نہیں سمجھتا جیسے مغرب میں شراب نوشی یا زنا گناہ ہی تصور نہیں ہوتے مگر اہل ایمان اگر ایسے ہی کسی قبیح عمل کا ارتکاب کر بیٹھیں تو اس میں جو احساس ندامت پیدا ہوتا ہے وہ اللہ کو بہت پسند ہے۔

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیئے
قطرے جو تھے مرے عرق انفعال کے

یا بقول فانی بدایونی

پا ہیتے ہی خجل رحم کا دریا امنڈ آیا
پردہ مری آنکھوں کا ابھی نم نہ ہوا تھا

استغفار و توبہ رجوع باللہ مطابقتی کردار کا نمونہ ہے جس میں درج ذیل پہلو پنہاں ہیں۔

☆ اول یہ کہ بندہ خیر و شر کے اسلامی معیار پر یقین رکھتا ہے۔
☆ وہ عمل ممنوعہ کا ارتکاب کرنا نہیں چاہتا

☆ اس سے لغزش ہوئی ہے جس پر وہ شرمندہ ہے

☆ بندہ اللہ کی شانِ عفو کو اپنے گناہ سے وسیع تر جانتا ہے۔

مندرجہ بالا تمام عوامل ایمان کی نشاندہی کرتے ہیں جن کے زندگی میں انفرادی واجتماعی پیمانہ پر جاگزیں ہو کر گمراہی کی نفی ہو جاتی ہے ایک ''سہو ندامت خیز باقی رہتا ہے'' ایسا احساس رکھنے والا نہ اپنے لیئے مُضِر ہو سکتا ہے نہ دوسروں کے لیئے چنانچہ وہ اپنے رب کے نزدیک بھی قابل معافی ہے۔ گنہہ سے جھوٹ انکار یا اس کا جواز پیش کرنا قابل قبول نہیں۔

دعا

حقیقی معنوں میں اگر دیکھا جائے تو استغفار بھی ایک دعا ہی ہے جو بعد ارتکاب گناہ کی جاتی ہے مگر دعا اپنے بسیط معنوں میں استغفار اور توبہ سے وسیع تر کرداری نمونہ ہے یہ عمل بھی ''رجوع باللہ کرداری نمونہ'' کی ہی قسم ہے مگر اس کے متعدد پہلو ہیں۔ دعا کے لفظی معنی تو چاہنے کے ہیں چاہنے کہ حوالے بہت ہیں یعنی دعاؤں کی کئی قسمیں ہیں۔ مگر اپنے مستعمل اصطلاحی معنی میں بندے کا اللہ سے وہ کچھ چاہنا یا مانگنا جو بندے کے اختیار میں نہ ہو۔ اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے بندہ عاجز و مجبور ہے وہ اپنی تمام آرزوں کی تعمیل و تکمیل پر قادر نہیں اور اللہ قادر و قدیر و مقتدر ہے۔ چنانچہ بندہ اللہ کا محتاج ہے اور اللہ سے مانگے بغیر اس کا گزارا نہیں ہے چنانچہ جب وہ خود کو عاجز پاتا ہے تو اللہ سے رجوع کرتا ہے اسی لیئے دعا ایک بہت بڑا اور اہم ''رجوع باللہ کرداری نمونہ'' ہے۔

لوگ بالعموم ایسی صورت حال سے فرار وگریز کا رویہ اختیار کرتے ہیں جہاں ان سے کچھ طلب کیا جائے اس لیئے کہ عوامی سطحی تصور کے مقابلے میں

''دینا'' گھاٹا ہے اور ''لینا'' فائدہ ہے مگر ذات باری تعالیٰ ''نفع ونقصان'' سے بالاتر ہے اسی لیئے وہ مانگنے والے کی ہمت افزائی کرتا ہے چنانچہ قدیم سے آج تک ''مانگنا'' یعنی دعا بندے کا ایک مستحب عمل رہا ہے اور دینے والے اللہ (بخشنے والے) کے در سے کبھی انکار نہیں ہوتا بشرطیکہ یہ طلب کسی کے حقوق تلف کرنے یا ناجائز کے لیئے (بددعا) نہ ہو۔

ترمذی کی حدیث شریف ہے ''دعا مانگنے سے بہتر اللہ تعالیٰ کو کوئی عمل عزیز نہیں'' حدیث قدسی میں ہے ''اے ابن آدم اگر تو مجھے پکارتا رہے گا اور مجھ سے بخشش کی امید رکھے گا تو میں تجھ کو بخشتا رہونگا خواہ تو کچھ بھی کرتا رہے مجھے اس کی پروا نہیں'' ابوداؤد کی حدیث شریف ہے کہ جب کوئی بندہ اس کے آگے ہاتھ پھیلاتا ہے تو اس کو اپنے بندے کو ہاتھ خالی بھیجتے ہوئے شرم آتی ہے۔''

جہاں تک دعاؤں کی مختلف اقسام کا تعلق ہے تو ہم ان کو درج ذیل قسموں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔

☆ قرانی دعائیہ آیات ☆ مسنون دعائیں

☆ انبیاء کی دعائیں ☆ اصفیا کی دعائیں

☆ انفرادی دعائیں

ذیل میں مندرجہ بالا کا مختصر بیان ہے

قرانی دعائیں

یہ قران حکیم کی وہ آیات ہیں جن میں مختلف قسم کی دعائیں ہیں سب سے

پہلی ایسی دعا تو سورۂ فاتحہ میں ہی موجود ہے۔ جس کے لیئے سرکار صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ قران کی سب سے عظیم سورت ہے۔ ''ہمیں راہ مستقیم کی ہدایت دے جس پر چلنے والوں کو تو نے اپنی نعمتوں سے نوازا نہ کہ وہ جن پر تیرا غضب ہوا اور وہ گمراہ ہوئے'' یہ وہ دعا ہے جو ہر نماز کی ہر رکعت میں یعنی دن میں کم از کم ۳۲ مرتبہ پڑھی جاتی ہے۔ اسی طرح رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وّ۔۔۔ یہ دعا بھی دن میں کئی مرتبہ پڑھی جاتی ہے علیٰ ھٰذا قران پاک کی بہت سے دیگر آیات بھی دعائیہ ہیں جن کے ورد سے ''تلاوت کا ثواب بھی ہے اور دعا کا بھی''

مسنون دعائیں

یہ وہ دعائیں ہیں جو نبی کریمؐ کا ورد تھیں ان میں بعض آیات قرانی ہیں اور بعض ان کے علاوہ مگر دو دعائیں خاص ہیں جن کو سرکار صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت خاص ہے ایک دعا یہ ہے کہ ''اے میرے رب مجھ کو خوبی کے ساتھ پہنچایئے'' (مدینہ سے مکہ میں اور بعض کے نزدیک اشارہ بیت اللہ شریف کی طرف ہے) اور مجھ کو خوبی کے ساتھ لے جایئے (مکہ سے مدینہ) اور ایسا غلبہ مجھے دیجئے جس میں نصرت ہو'' دوسری دعا ہے ''اے میرے رب میرے علم میں اضافہ فرما'' ان کے علاوہ بہت سے مواقع کے حوالے سے بہت سی دعائیں مسنون ہیں جن کا دوہرانا بے حد ثواب کا موجب ہے اور ان کا ورد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت کو محکم کرتا ہے ان کی تعداد ۱۰۶ بتائی جاتی ہے۔

انبیاء علیہم السّلام کی دعائیں:

مسنون دعا کے علاوہ بعض ایسی دعائیں قران پاک میں مذکور ہیں جو مختلف

مواقع پر اپنی اپنی زندگیوں میں مختلف انبیاء علیہم السلام نے کی ہیں ان میں درج ذیل ہیں۔

حضرت آدم علیہ السّلام کی دعا...... حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی دعا...... حضرت زکریا علیہ السّلام کی دعا...... حضرت نوح علیہ السّلام کی دعا...... حضرت ایوب علیہ السّلام کی دعا...... حضرت یوسف علیہ السّلام کی دعا...... حضرت یونس علیہ السّلام کی دعا...... حضرت سلیمان علیہ السّلام کی دعا...... حضرت شعیب علیہ السّلام کی دعا...... حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی دعا...... حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کی دعا...... حضرت لوط علیہ السّلام کی دعا......

مندرجہ بالا میں حضرت آدم علیہ السّلام اور حضرت یونس علیہ السّلام کی دعائیں زبان زد خاص و عام ہیں۔

اصفیا کی دعائیں

مندرجہ بالا کے علاوہ بہت سے دعائیں اصفیا و کاملین سے بھی منسوب ہیں جن کی تعداد کثیر ہے زیر نظر تحریر میں اس وقت صرف ایک دعا کا حوالہ دیا جار ہا ہے۔ یہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی دعا ہے جس کے رموز قابل غور ہیں دعا یہ ہے۔

''اے میرے رب مجھے توفیق عطا فرما کہ جن چیزوں میں تیری طرف سے عجلت ہے ان میں میں تاخیر نہ چاہوں اور جن میں تیری طرف سے تاخیر ہے ان میں عجلت نہ چاہوں......'' غور فرمایئے کیا مانگا؟ صرف توفیق رضا...... یعنی کوئی تقاضائے نفس بھی نہیں کیا اور دعا مانگنے کے حکم کی تعمیل بھی ہوگئی۔ یہ اہتمام ہم جیسے غرض مند افراد کی دعاؤں میں نہیں ہوتا۔

انفرادی دعائیں

ہم جیسے غرض مند کم حوصلہ اور خطا کار افراد جو دعائیں کرتے ہیں ان میں اولیا و انبیاء کی سی دعائیہ عظمت نہ ہوتی ہے اور نہ ہوسکتی ہے دور ھٰذا کے صالحین جو بالعموم نماز کے بعد اور اہم راتوں اور خاص اوقات میں جو دعائیں مانگتے ہیں وہ درج ذیل امور و عناصر پر مشتمل ہوتی ہیں۔

افضل دعائیہ عنصر آخرت و مغفرت و شفاعت کے لیئے دعائیں ہیں ان میں دعا کے ساتھ استغفار و توبہ کی چاشنی بھی ہے کہ بندہ اپنے رب کے حضور اپنے ایمان و عمل کے حوالے سے اپنی لغزشوں کوتاہیوں خطاؤں اور صغیرہ و کبیرہ گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے احساس ندامت کے ساتھ سب کچھ جاننے والے اپنے رب کے سامنے معافی کا طلبگار ہو کر آخرت میں خیر و جزاء اور عفو و درگزر کا سوال کرتا ہے یہ بڑی سعادت والی دعائیں ہیں۔

دوسرا عنصر ہماری انفرادی دنیا میں ''طلب حسنات'' ہے کہ آدمی مرنے سے پہلے بھی اس حیات عارضی میں بھی چین سکون آرام عزت رزق صحت درازی عمر اور خیر و عافیت کے لیئے اس کا فضل و کرم چاہتا ہے اور اس کے حبیب پاک ﷺ کے حوالے سے بھی خیر و محبت و عطا و کرم کے لیئے دعا گو ہوتا ہے۔ راقم کو اپنی ایک منظوم دعا یاد آئی شاید بے محل نہ ہو اگر ذیل میں پیش کردوں یہ دعائیہ وقت سحر قبل فجر پڑھنے کی برکت بہت ہے اگلے صفحہ پر۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دعائے سحر گاہی

مرے مالک یہ بھی احسان کردے
مراحل زیست کے آسان کردے
مرے اعمال سے تو درگزر کر
مری تقویتِ ایمان کردے
شعارِ بندگی و عبدیت کو
محیطِ قلب و جسم و جان کردے
ملے توفیقِ مدحِ شاہِ والا
مری بخشش کا یہ سامان کردے
حیات و موت و قبر و حشر و آخر
بحقِ مصطفےٰ ﷺ آسان کردے
صلوٰۃ اللہ علیٰ خیرالوریٰ ﷺ کو
مرے وردِ زباں ہر آن کردے
بجز تیرے نہ ہو سجدہ کسی کو
یہ میری ذات کی پہچان کردے

الٰہی اسمِ پاک مصطفےٰ ﷺ کو
مرے افسانے کا عنوان کردے
مری خلوت نشینی میرے مولا
برنگ خاصئہ خاصان کردے
جنابِ رحمتہ اللعالمین ﷺ کو
مرا ہر طرح نگہبان کردے
مری کوتاہیٔ اعمال صالح
مبرّا برسرِ میزان کردے
آمین

(فائقؔ بدایونی)

ہماری انفرادی دعاؤں میں آخرت۔ ایمان کی سلامتی کے علاوہ دنیا کے اور ذات کے حوالے سے درازی عمر۔ صحت کاملہ رزق وافر۔ عزت آبرو۔ آسانی سہولت اور جملہ اقسام خیر کے لیئے دعا کے علاوہ اپنے بیوی بچوں گھربار اولاد اور اولاد کی اولاد کے لیئے اعزا وا قارب جملہ حاجت مندوں مسکینوں مسافروں اور طلبان خیر کے علاوہ پوری امت مسلمہ اور بنی نوع انسان کے لیئے اس کے کرم فضل کی درخواست ہوتی ہے اور فقرا و کاملین کا طریقہ تو ہے کہ وہ بغیر تفریق رنگ ونسل وزبان مذہب دعا کرتے ہیں کہ

''کُل کی خیر کُل کا بھلا''

انفرادی دعا کی نفسیات

قرانی اور مسنون دعاؤں کے علاوہ اگر ''نفس عامہ'' کی دعاؤں کا تجزیہ کیا جائے تو دعا کی نفسیاتی اہمیت کے رموز سامنے آتے ہیں ہماری انفرادی دعائیں کیا ہیں؟ اپنے رب کے سامنے وہ سب کچھ کہہ ڈالنا جو ہم دوسروں کے سامنے نہیں کہہ سکتے بلکہ اپنے شعور اور سپر ایگو (Superego) سے بھی چھپاتے ہیں۔

نفسیاتی لحاظ سے فرد کے ذہن کو شعور و لاشعور میں تقسیم کرنا پرانی نفسیاتی روش ہے۔ ''شعور آگہی ہے اور لاشعور بھول کا وہ خزانہ ہے جس میں سارا انفرادی واجتماعی ناپسندیدہ اور غیر صالح مواد بھرا ہوا ہے۔''

فرد کے وہ تمام ناپسندیدہ اور خود فرد و معاشرے کے لیئے ناقابل قبول وہ آرزوئیں۔ محرکات اور ضروریات ہیں جن کو اپنی اصلی شکل میں ہمارے اخلاقی معیارات اظہار و تکمیل کی اجازت نہیں دیتے وہ تمام شکستیں اور محرومیاں (Frustrations) اور تضادات (Conflects) جو تشنۂ تکمیل و تسکین رہتے ہیں ہمارے لاشعور کی گہرائیوں میں دفن کر دیے جاتے ہیں'' یہ وہ نفسیاتی مردے ہیں جو دفن ہو کر بد روح بن جاتے ہیں'' یہ وہاں خاموش نہیں پڑے رہتے بلکہ فعال رہتے ہیں اور کسی نہ کسی صورت اپنی تسکین کی راہیں تلاش کرتے رہتے ہیں ہماری ''سپر ایگو'' اخلاقی معیار سے بچ نکلنا چاہتے ہیں تو اسے دھوکہ دیتے ہیں اور اپنی بدلی شکل میں علامتی طور سے یا تو خوابوں میں تسکین پاتے ہیں یا پھر کرداری فسادات (Behaviour Disorders) کی شکل میں مرض بن کر اپنا اظہار کرتے ہیں اور تسکین چاہتے ہیں اور جب تک یہ لوٹ کر اپنی اصلی شکل میں شعور تک نہ آئیں بے چین ہی رہتے ہیں اور نفسیاتی مرض یا تو شدت اختیار کرتا جاتا

ہے یا مستقل قائم ہو جاتا ہے ایسے امراض پر دوائیں کام نہیں کرتیں ان کا معالجہ تو یہ ہے کہ ماہر نفسیات اپنی مشاورت و مہارت سے مریض کے تعاون کے ساتھ انہیں دوبارہ شعور سے گزارے کہ یہ ختم ہو جائیں جب یہ تعقیب شدہ جذبات (Repressed Sentimens) دوبارہ شعور میں آتے ہیں تو مریض کو کرب و اذیت کے اس تجربہ سے گزرنا پڑتا ہے جس کے دباؤ سے بچنے کے لیئے ذہن نے انہیں لاشعور میں دبا کر شعور کو صعوبت سے بچا لیا تھا۔ ماہر نفسیات کی تمام تدابیر جن کے ذریعہ اس کی رسائی ان دفن شدہ جذبات تک ہو سکے اور مریض کو ان کا اعادہ ہو جائے نفسیاتی معالجہ (Psychotherapy) کی تعریف میں آتے ہیں۔

ماہر نفسیات مریض کا معالجاتی اعتماد حاصل کر کے اسے اس بات پر مائل کرتا ہے کہ مریض بغیر کسی خوف و احتیاط کے وہ سب کچھ روانی سے بیان کرتا رہے جو اپنی تکلیف کے حوالے سے اس کے ذہن میں آتا رہے جب مریض ان ہدایات کے مطابق بولنا اور مرض و تکلیف کے متعلقات کو بے لگام سوچنا اور یاد کرنا شروع کرتا ہے تو اسی ''شعور کی رو'' میں دبائے ہوئے جذبات بھی شعور میں آجاتے ہیں اور مریض اس کے درد و کرب کو محسوس کر کے نڈھال ہو جاتا ہے اور اپنی ''بھڑاس'' نکل جانے کے بعد سکون محسوس کرتا ہے اس طریقہ بیان کو ازاد تلازم (Free Assiciation) کہتے ہیں اور یہی اس کا حقیقی علاج ہے۔

اب ان حولوں سے دعا کے عمل کا تجزیہ کیجئے تو اس میں بھی بندہ اپنے رب کے آگے وہ سب کچھ بیان کر دیتا ہے جو اس کے لاشعور کی گہرایوں میں چھپا ہوتا ہے (Free Association) اسے بیان کر کے اسے رقت و ندامت بھی ہوتی ہے

اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے (Catharsis) اس کا باطن پاکیزہ ہو جاتا ہے (Psychotherapy) یعنی دعا میں نفسیاتی معالجہ کے تمام عوامل موجود ہیں صرف یہ کہ کوئی غیر معالج نہیں ہوتا اس لیئے ہم اسے ''خود نفسیاتی معالجہ'' (Auto Psychotherapy) کہہ سکتے ہیں۔

طلبِ رضائے الٰہی

یہ رجوع باللہ اسلامی کرداری نمونوں میں سے سب سے بڑا اہم ترین اور آخری کرداری نمونہ ہے اس میں وہ تمام افعال و کردار شامل ہیں جن کا اپنانا یا جنہیں ترک دینا اس لیئے ہو کہ اپنے رب کی رضا حاصل ہو جائے ''طلبِ رضائے الٰہی'' سب سے بڑی سعادت اور حصولِ رضائے الٰہی سب سے بڑا انعام ہے اس کی رضا چاہنے والا اور کچھ نہیں چاہتا وہ ہر شے کی طلب سے غنی ہو جاتا ہے اس کی طرزِ فکر جیسا کہ راقم نے ایک منقبت میں عرض کیا ہے یہی ہوتی ہے کہ:

جنہیں جاہ و حشم مطلوب ہو جاہ و حشم چاہیں
مگر ہم تو فقط تیری رضا تیرا کرم چاہیں
نہ کچھ اس سے زیادہ چاہیں نہ کچھ اس سے کم چاہیں
طلب ایسی عطا کردے جو تو چاہے وہ ہم چاہیں
ہماری چاہتوں پر بھی رہے تیری نگہبانی

اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ فرد اور اس کے ماحول کے تمام وقوعات اللہ کی مرضی سے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان سے نہ خوف کھانے والے اور نہ غمگین ہونے والے اللہ کے دوست ہیں اس منزل پر پہنچ کر نفس کو اطمینان

کی وہ منزل نصیب ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔''اے نفس مطمئنہ تو مجھ سے راضی ہوا اور میں تجھ سے۔آ میری عبدیت اور میری جنّت میں داخل ہو جا۔

''اب اس کے بعد تو گنجائش دعا بھی نہیں''

مختصر یہ کہ طلبِ رضائے الٰہی کسی دوسرے سے نہیں اپنے رب سے ہی طلب کرنے کی چیز ہے اسی لیئے یہ رجوع باللہ ایک ایسا رویّہ یا کرداری نمونہ ہے جو فرد میں حاجات دنیاوی اور ان کی تکمیل کے لیئے دستیاب و نایاب وسائل اور ذرائع سے وہ استغنٰی پیدا کر دیتا ہے کہ اس کے بعد کسی نفسیاتی شکست و محرومی اور ذہنی تضاد و تعقیب (Repression) کے لیئے کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی جس سے نفسیاتی سقائم پیدا ہونے کا امکان یکسر ختم ہو جاتا ہے۔اس کرداری نمونے کے ذریعہ عبد کی رضا معبود کی رضا میں ضم ہو جاتی ہے اور''من و تو'' کی بحث ختم ہو کر ایک چھوٹے وجود کے تمام چھوٹے بڑے تقاضہ ختم ہو جاتے ہیں۔یہ عمل آسان نہیں ہے اس کے لیئے فرد کو اپنے نفسانی تقاضوں پر حاوی ہو کر انہیں توفیق ایزدی سے یکسر ختم کرنا پڑتا ہے بظاہر تو یہ کرداری نمونہ رجوع بالنفس کردار کی ایک شکل نظر آتا ہے مگر اپنے نفس سے رجوع کر کے اسے اپنی ہر ضرورت ہر آرزو اور ہر ارادے سے آزاد کر دینا ایک عام آدمی کے بس کی بات نہیں سوائے اس کے کہ اسے کسی کامل ولی اللہ کی نظر فیض بخش کا سہارا نصیب ہو اور وہ بھی بغیر توفیق الٰہی ممکن نہیں جس کے لیئے اول و آخر بندے کو اللہ سے ہی رجوع کرنا ہوتا ہے

مجاہدہ

یہ لفظ''جہد'' کے مصدر سے مشتق ہے جس کے معنی کوشش کرنے کے ہیں اور اس کا اسم فائل مجاہد ہے جو اللہ کی راہ میں کوشش یا جہاد کرنے والے کے لیئے

آتا ہے اور جہاد کی ایک شکل جہادِ اکبر بھی ہے ''یہ اپنے نفس سے جہاد ہے'' چنانچہ اس حوالے سے مجاہدہ رجوع بالنفس وہ کردار یا کرداری نمونہ ہے جس کے تحت ''نفس امارہ کو مار کر فرد نفس مطمئنہ کی منزل پر متمکن ہوتا ہے''۔ مجاہدہ کوئی ایک عمل نہیں بلکہ سعی و عمل کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جو نفس امارہ کی ہر پکار کے خلاف جہاد ہے۔ ویسے تو ہر شخص اپنی بساط و توفیق کے مطابق مجاہدہ کرتا ہی ہے مگر یہ کرداری نمونہ عام فرد سے زیادہ ان پرہیز گار اور خیر پسند صوفیا و اولیا کا کردار ہے جن کے مجاہدات سے تاریخ بھری ہے۔

صوفیا کے مجاہدہ میں شاید پہلا درجہ تو ''کم گفتن و کم خوردن و کم خفتن ہے'' انسان کو حیوان ناطق بنایا گیا ہے بولنا اور بولنے کے لیئے تحریک محسوس کرنا اس کا ایک فطری عمل ہے۔ اور تقاضائے نفس ہے چنانچہ بولنے کے خلاف سعی بھی کم بولنا مجاہدے کی ایک اہم شکل ہے بسیار گوئی اور یادہ گوئی اسلام کے اخلاقی نظام میں ناپسندیدہ قدر ہے ویسے بھی عام اخلاق کے مطابق بردبار لوگ کم بولتے ہیں مگر راہ سلوک میں چلنے والے کم گوئی کی خو ڈالتے ہیں کہ ان کے ذریعہ کہیں باطن کے راز افشا نہ ہو جائیں برصغیر کے کاملین میں تو ایک ایسے بزرگ بھی گذرے ہیں کہ کسی نے ان کو کسی بھی حال بولتے سنا ہی نہیں اس لیئے ان کا لقب ''چُپ شاہ میاں'' ہو گیا یہ بزرگ غالباً رامپور میں دفن ہیں خیر یہ تو انتہائے کمال کی بات ہے ویسے بھی دیکھا گیا ہے کہ ''کاملین کم گو'' ہوتے ہیں۔

انسان کی بڑی عضویاتی نفسیاتی ضرورت میں بھوک اور کھانا ایک بڑی ضرورت ہے یہ ضرورت ہمیشہ سے انسان کو لاحق رہی ہے۔ عام لوگ تو کسب معاش کے ذریعہ شکم سیری کرتے ہیں مگر خاصانِ خدا اس آگ کو اپنے ارادے اور

کوشش سے بھی بجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ''فاقہ کشی'' سرکار ﷺ اور آپ کی امت کے اکثر خاصان کا شعار رہا ہے ویسے بھی اسلام عام فرد کے لیئے بسیار خوری پسند نہیں کرتا چنانچہ رجوع بالنفس کردار کے مجاہداتی کرداری نمونوں میں ''کم خوردن'' ایک اعلیٰ درجہ کا مجاہدہ ہے۔

مجاہدے کی تیسرے اہم شکل ''کم خفتن'' ہے بھوک کی طرح نیند بھی ایک بنیادی انسانی ضرورت ہے۔ فطرت میں نیند کا عمل نشو نما کے مدارج سے بھی ابتدائی تعلق رکھتا ہے۔ بچہ ابتدائی دنوں میں زیادہ سوتا ہے اور کم جاگتا ہے مگر جوں جوں وہ نشائی مدارج طے کرتا ہے سونے کی مدت کم ہو جاتی ہے۔ عام عاقل و بالغ فرد کو ۲۴ گھنٹہ میں چھ یا سات گھنٹہ کی رات کی نیند کافی ہے۔

زیادہ سونا اسلام کے اخلاقی نظام کا پسندیدہ عمل نہیں ہے ہر چند کہ رات آرام کے اور سونے کے لیئے ہے مگر اسلامی اقدار کے لحاظ سے ''رات سو کر اٹھنے کے لیئے ہے'' قران مجید رات ختم ہونے سے پہلے اٹھنے کا حکم دیتا ہے۔ دنیاوی لحاظ سے بھی صرف اس قدر سونا کافی ہے کہ غلبہ نیند ختم ہو جائے صبح اٹھ کر اونگتے رہنا یا کاہلی میں پڑے رہنا بھی ناپسندیدہ عمل ہے۔ ادائے فجر کے لیئے طلوع سے پہلے جاگنا ضروری ہے اور اگر اس سے بھی زیادہ جاگنا اور رات کو اٹھ کر تلاوت کرنا نصیب ہو تو یہ قابل فخر ہے۔ اپنے نفس سے مجاہدہ کرنے والے بہت کم سوتے ہیں اور اکثر صوفیا و بزرگان کم و پیش شب بیدار ہوتے ہیں اور کم سونے سے بچنے والا وقت کار ہائے خیر میں صرف کرتے ہیں۔

اپنے نفس سے جہاد کرنا یعنی مجاہدہ عام مسلمان بھی کرتے ہیں اور صوفیا و بزرگان بھی مگر ہر دو کے مجاہدے میں فرق یہ ہے کہ اہل دنیا یعنی مسلمانوں کا مجاہدہ

شرعی ممنوعات کے خلاف ہوتا ہے اور وہ اپنے نفس کو خلافِ شرع افعال سے بچانے کے لیئے شرعی مجاہدے کرتے ہیں جبکہ صوفیا و اولیاء اکرام کا مجاہدہ اپنی نفسانی خواہشات کو ختم یا معتدل کرنے کے لیئے ہوتا ہے۔

غرض یہ کہ اپنے اخلاقی معیارات و اقدار کے مطابق نفس کو پابند احکام رکھنے کے لیئے اوپر بیان کردہ تین کرداری نمونوں کے علاوہ مجاہدات کی اور بہت سی شکلیں ہیں جن کی تفصیل سے بہ خوف طولات گریز کیا جارہا ہے۔ ویسے نفس امّارہ کو احکامات شرعیہ کے مطابق رکھنے کے لیئے رجوع بالنفس تمام ہی کرداری نمونے مجاہدے کی تعریف میں آتے ہیں اور چھوٹے یا بڑے پیمانے پر ہر جگہ مجاہدے کا کردار معاشرے کو صالح بنانے کے لیئے نہایت اہم ہے اگر ہر ہر فرد خود کو اصولوں اور اچھی قدروں کا پابند کرلے تو پورا معاشرہ سدھر جائے گا۔

صبر

رجوع بالنفس کرداری نمونوں میں ''صبر'' ایک اہم کرداری مطابقت کا نمونہ ہے جسمیں فرد خود اپنے ساتھ معاملہ کرکے اپنے ذہنی تضادات اور شکست و محرومیوں سے بچ کر سکون کی منزل پر فائز ہوتا ہے اس میں نفسیاتی صعبتوں، شکستوں اور محرومیوں کے لیئے فرد کی سطح برداشت بہت بلند ہوجاتی ہے۔ صابر وہ ہے جس کا سب کچھ لٹ جائے مگر وہ صبر کی دولت کو نہیں لٹنے دیتا قصص قرانی میں حضرت ایوبؑ کا صبر انسانی عظمت کا بہترین نمونہ ہے اور تاریخ اسلام میں حضرت حسینؓ کا صبر اور راقم کی نظر میں امام زین العابدینؒ کا صبر انسانیت کے اعلیٰ ترین جوہر کا نمونہ ہے صبر کے لیئے ارشاد ہے کہ ''اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

صبر کی نفسیات میں صابر کا وہ کردار کہ وہ اللہ کے لیئے اسے بھی ترک کر دیتا ہے جو وہ حاصل کر سکتا ہے۔ وہ سب کچھ کھو کر شاکر بھی رہتا ہے اور راضی بھی یہ بڑی نفسیاتی شخصیت کا خاصہ ہے دنیا تو شکست و محرومی سے بچنے کے لیئے ذہنی تضادات (Conflicts) کا شکار ہو کر نفسیاتی امراض میں مبتلا ہوتی ہے مگر صابرین کی نفسیاتی صحت جس کا راز حُب اللہ ہے قابل رشک ہے ہم جو حاصل نہیں کر سکتے اس کا ترک اور جو نہیں ٹال سکتے اس کا قبول صبر نہیں ہے بلکہ صبر کی منزل اس سے آگے ہے اس میں رضائے الٰہی کے لیئے اسے بھی ترک کرنا پڑتا ہے جو قابل حصول ہے اور اسے بھی قبول کرنا پڑتا ہے جو ٹل سکتا ہے۔

رابعہ بصری کی صوفیائے دمشق سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے دریافت کیا صوفیائے دمشق کیا کرتے ہیں جواب ملا کہ ''مل جاتا ہے تو کھا لیتے ہیں نہیں ملتا تو صبر کرتے ہیں'' آپ نے فرمایا یہ تو میری گلی کا کتا بھی کرتا ہے تو پوچھا کہ صوفیائے بصرہ کیا کرتے ہیں جواب ملا کہ ''مل جاتا ہے تو دوسروں کو کھلا دیتے ہیں نہیں ملتا تو شکر کرتے ہیں'' پتہ چلا کہ نہ ملنے پر شکر کرنے والے صابرین ہیں۔

اس منزل پر مغرب کے ماہرین نفسیات آئیں اور جواب دیں کیا اس مطابقی کردار کے حامل افراد نفسیاتی محرومی کا شکار ہو کر ذہنی فساد میں مبتلا ہو سکتے ہیں؟ نہیں ہرگز نہیں۔ نفسیاتی معاملات اور مباحث تو فرد کے نفس کی کارگزاریوں سے پیدا ہوتے ہیں مگر صابر کا نفس ہر نفسانی تحریک پر حاوی اور ہر نفسانی طلب پر غالب ہوتا ہے وہ اس مقام پر مطمئن رہتا ہے جہاں سب منتشر ہو جاتے ہیں

لاکھ دینے کا ایک دینا ہے
دل بے مدعا دیا تو نے

توکّل

یہ صبر اور مجاہدے کے بعد کے درجہ کا ایک اہم تر رجوع بالنفس کرداری نمونہ ہے۔ توکل کے معنی کسی کو وکیل بنانے یا اپنے معاملات دوسرے کے سپرد کر دینے کے ہیں۔ زیرِ نظر حوالے میں توکّل ایک ایسا کرداری نمونہ ہے جسمیں بندہ اپنے جملہ معاملات اور ان کے عواقب اللہ تعالیٰ کے سپرد کر کے راضی بہ رضا ہو جاتا ہے۔ یہ کام آسان نہیں ہے طویل مجاہدے اور صبر کی منازل طے کرنے کے بعد بندہ اس منزل پر متمکن ہوتا ہے۔ وکیل اللہ تعالیٰ کا اسم صفت ہے اس لیئے وہ بندے کی وکالت کی پیش کش قبول کر کے اس کا نگرانِ اعلیٰ بن جاتا ہے ویسے تو اسے اختیار ہر بندے پر حاصل ہے مگر ایک کرداری نمونے کی حیثیت توکل وہ نمونہ ہے جہاں بندہ اپنے جملہ اختیاراتِ نفس اپنے ارادہ سے اللہ کے سپرد کر کے کہتا ہے۔

اَنَا عَبِدُهٗ وَلَیْسَ لِا لعَبْدِ مَعْ سَیِّدِہٖ اِخْیَارٌوَّلَا اِرَادَہْ

حضرت غوث پاک رضی اللہ عنہ کا یہ فرمان ہے کہ اللہ کے آگے بندے کا کل اختیار وارادہ ''لا'' ہو جاتا ہے یہ توکّل کی بہترین شرح ہے فطرت انسانی پر غور کیجیئے تو آپ کو جتنے بھی شواہد ملینگے ان میں تقاضائے نفس ''مَیں اور میرے ارادہ اور اختیار'' کی ہی تمنا ہے مگر میں ایک ایسے مرحوم ولی اللہ اور کامل فقیر سے بخوبی واقف ہوں اور انہیں میں نے نہایت قریب سے طویل عرصہ تک دیکھا ہے اور ان کے ساتھ رہا ہوں جنہیں اللہ تعالیٰ نے بے حساب باطنی اختیارات اور نعمتیں عطا فرمائی تھیں مگر وہ ایک ایسے بے اختیار بندے کی طرح رہے کہ لوگ ان کے احوال ظاہری سے ہمدردی کر کے ان کے لیئے دعا گو ہو جاتے تھے مجھ سے وہ پردہ

نہیں رکھتے تھے مگر زبان بند کردی تھی کہ کبھی اور کسی طرح ان کا راز ظاہر نہ کروں۔ ہاں یہ ضرور فرماتے تھے کہ میری آنکھ بند ہونے کے بعد جس طرح چاہو سرکار ﷺ کے کرم کو خوب بیان کرنا محولہ بالا فرمان ان کے رہائشی کمرے کی دیوار پر ایک کتبہ کی شکل میں آویزاں تھا۔ وہ قادری سلسلہ کے بزرگ تھے اور فرماتے تھے پورے سلسلے میں گھوم آؤ ''اَنَا عَبدُہٗ'' بس یہیں ملے گا۔ اللہ ان کے مدارج ومقامات مزید بلند فرمائے۔آمین

کامل توکّل نہ سہی اگر آج ہمارے ملک وقوم کے افراد ''سرمایہ داری وزرداری'' کے چکر سے نکل کر سو فی صد نہیں بلکہ اس کے عشرِ عشیر کو بھی کردار اور نیّت پر نافذ کرلیں تو ہمیں ہمارے کھوئے اعزازات پھر واپس مل جائیں اور معاشرے سے ہوسِ نام وزر ختم ہو کر اسلام کی حقیقی قدروں پر پرورش پانے والے رجوع بالنفس کردار کے اعلیٰ مطابقتی نمونے عام ہو جائیں۔ مگر توکّل کے لیئے مکتب کی کرامت کے ساتھ فیضانِ نظر بھی درکار ہے۔

فقر

یہ عوام کا نہیں خاصانِ خدا کا کرداری نمونہ ہے ویسے تو ہر وہ آدمی جو اپنی ضروریات پوری کرنے کے وسائل نہ رکھتا ہو اور ان کے لیئے دوسروں کا حاجت مند ہو فقیر ہے۔ شرعی اصطلاح میں یہ غنی کی ضد ہے یعنی وہ جس پر زکوٰۃ لازم نہ ہو بلکہ وہ زکوٰۃ لینے کا مستحق ہو فقیر ہے سرکار ﷺ نے اپنے حوالے سے جس فقر کا اشارہ کیا ہے اور جسے اپنا فخر کہا ہے وہ ہے کہ جس میں بندہ اللہ کے سامنے ہر طرح کا محتاج ہو اور ضروتوں کی تسکین کے لیئے غیر اللہ کی طرف نہ دیکھے اکثر اولیائے

کرام و بزرگان دین کا یہ طریقہ رہا ہے کہ جب بھی انہیں مِلک نصیب ہوئی راہِ خدا میں خرچ کر دی اور پھر اللہ کی طرف متوجہ ہو گئے۔

جہاں تک مِلک و دولت کا سوال ہے تو یہ بڑا دھوکہ ہے جسے دولت دنیاوی دی گئی وہ عارضی طور سے اس کے زیر تصرف ہے جسے بہر حال دوسروں کے پاس جانا ہے۔ ان میں فقیر وہ ہے جو اپنے زیر تصرف تمام دولت اللہ کے نام پر صرف کر کے بے زر و بے پروا ہو کر بیٹھ جائے یہ طریق انبیا علیہم السّلام اور اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ عمل اور ایسا کرداری نمونہ ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت اور رسالت کو اپنا فخر نہیں کہا فقر کو کہا کہ یہ زردار ہو کر بے زر ہو جانا ہے۔ یعنی تقاضائے نفس کے خلاف ایک جہاد ہے عام آدمی تو بے زر ہو کر زردار ہونا چاہتا ہے مگر فقیر بے زر ہو کر جو تونگری حاصل کرتا ہے وہ قابل رشک ہے۔

بعض شکلوں میں انتہائی متموّل نظر آنے والا اور زرِ کثیر رکھنے والا جو دوسروں کو غنی اور دولتمند نظر آئے اپنے رویّہ میں فقیر ہوتا ہے کہ دنیا اس کے دل میں جگہ نہیں کرتی نہ وہ طالب دنیا ہوتا ہے مگر اس کی طلب تو عقبیٰ سے بھی آگے بڑھ کر صرف ''مولا'' کی طلب ہوتی اس کا دل آرزوں کا بت کدہ نہیں بلکہ بیت اللہ ہوتا ہے سرکار صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے اکثر اولیاء و بزرگان میں یہ خاصہء فقر ملتا ہے حضرت غوث اعظم رضی اللہ عنہ اس حوالے سے بھی سردار الاولیاء ہیں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فقر کا خرقہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو عطا کیا جن سے یہ دولت اہل سلاسل کو نصیب ہوئی۔

اس کرداری نمونے سے جو نفسیاتی مطابقت وقوع پذیر ہوتی ہے وہ اعلیٰ اقدار کے حامل معاشرہ کی بنیادی خاصیت ہے جس میں حرص و ہوس و لالچ اور خود غرضی و زرداری کا نام نشان نہیں ہوتا۔

مختصر یہ کہ فقر راہِ خدا میں چلنے والوں کے لیئے سلوک کی ایک راہ ہے جس میں چلنے والے افراد کے حالات ظاہرہ فقیرانہ اور احوال باطنی تونگرانہ ہوتے ہیں۔ فقر کی حقیقی ماہیت اور اس کی تفصیلات سمجھنے کے لیئے حضرت سلطان باہو کی تصنیف ''عین الفقر'' انتہائی بامایہ کتاب ہے فقیر کے لیئے علامہ اقبال نے لکھا ہے۔

تمنا درد دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں
نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ ان کو
''ید بیضا'' لیئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

کہا جاتا ہے کہ ابھی تک چودہ سو سال میں فقر کی چھ ہستیاں گزری ہیں اور ساتویں ہستی کا ابھی ظہور نہیں ہوا۔ ایک بزرگ کی بشارت کے مطابق وہ قادریہ سلسلے کے بزرگ ہونگے اور وطن انڈونیشیاء ہوگا ابھی تک گذرنے والی چھ ہستیوں میں سے دو پاکستان میں مدفون ہیں واللہ اعلم بالصواب۔

تقویٰ

تقویٰ کے معنی اللہ تعالیٰ کے خوف سے ڈر کر اسلامی نظام اخلاق و اقدار کے تمام ناپسندیدہ افعال کو ترک کر دینا ہے یہ بڑا مجاہدۂ نفس اور بہت اہم رجوع بالنفس اسلامی کرداری نمونہ ہے جو نفسیاتی مطابقت صحیحہ پیدا کرنے اور اپنے نفس کی اصلاح کا ایک مسلسل عمل ہے جس میں ہر لمحہ فرد کو اپنے عمل ہی نہیں نیت، سوچ اور فکر پر بھی کڑی نظر رکھنی ہوتی ہے کہ وہ مرضی یار کے خلاف نہ ہو جائے خواہ وہ اپنی یا دوسروں کی دعائیں ہی کیوں نہ ہوں جیسا کہ مولانا حسرتؔ موہانی نے کہا

مرضیٔ یار کے خلاف نہ ہو
لوگ میرے لیئے دعا نہ کریں

یہ بڑا نازک اور کھٹن مقام ہے کہ زندگی کا ہر لمحہ اسی سوچ اور دھن میں گزرتا ہے ''مزاج یار برہم نہ ہوجائے'' تقویٰ کے لفظی معنی ڈرنے یا اللہ کے خوف سے موانع کو ترک کرنے کے ہیں۔

یہاں ایک نازک بات ملحوظ رکھنی چاہیئے کہ آخرت کے عذاب ''آگ جہنم اور سزا'' سے ڈرنے والے مسلمان تو بہت ہیں کیا ان کو اللہ سے ڈرنے والا کہا جائیگا 'بیشک ہاں'' مگر اللہ تعالیٰ سے حقیقی ڈرنے والا وہ ہے جو اس کے ناراض ہوجانے کے خوف سے لرزہ براندام رہے۔ سزا سے تو جانور بھی ڈرتا ہے کافر بھی ڈرتا ہے مگر سزا دینے والے سے ڈرنا اس کے ناراض ہوجانے کا خوف ہے اور حقیقی متقیئن وہ ہیں جو اللہ کے ناراض ہونے کے خوف کو اپنے نیت واعمال کا پیمانہ بنا کر خشیّت کی زندگی گذارتے ہیں۔

عام طور پر کہا جاتا ہے اور راقم کا عقیدہ بھی یہی ہے کہ قران بنی نوع کے لیئے ہدایت ہے مگر قران پاک اپنی ہدایت سے فیضیاب ہونے والا جن افراد کو قرار دیتا ہے ان کے لیئے درج ذیل چار شرائط عائد ہوتی ہیں۔

☆ وہ لوگ جنہوں نے تقویٰ کیا
☆ وہ جو غیب پر ایمان لائے
☆ وہ جنہوں نے قیام صلوٰۃ کیا
☆ وہ جنہوں نے اپنے رزق میں سے انفاق کیا

قرآن پاک کی زبان میں قرآن پاک کے ہدایت ہونے کے لیئے جو چار شرائط بیان کی گئی ہیں ان میں اول تقویٰ ہے۔ اب یہ مفسرین جانیں کہ یہ چاروں ضروری ہیں یا ان میں سے ایک یا چندہ بہر شکل ہدایت تقویٰ کرنے والوں کے لیئے ہے۔

تقویٰ اپنی نفسیاتی نوعیت کے لحاظ سے نفسیاتی مطابقت کا ایسا کرداری نمونہ ہے جس میں اپنے نفس سے فرد کو معاملہ کرنا ہوتا ہے اور جس میں ''بے لگام گھوڑے کو لگام دے کر جہاد زندگی میں استعمال کیا جاتا ہے'' یہ وہ عمل ہے جو ''مجاہدین۔ صابرین، متوکلین اور فقراء چاروں کے لیئے لازم ہے۔''

عام فرد کے لیئے غلطی کرنا ورثۂ آدم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے بندوں کے لیئے جن پر کھلے دشمن کا وار چل جاتا ہے پھر راہ مستقیم پر آ کے حق پر قائم ہو جانے کے لیئے 'استغفار'' کی نعمت عطا کی ہے جو ارتکاب گناہ کے بعد کا عمل ہے مگر ''تقویٰ'' ارتکاب گناہ کی طرف جانے سے روکنے والا عمل ہے جو توبہ سے افضل ہے خوف کا عنصر دونوں میں موجودہ ہے خوف نہیں بلکہ ''خشیّت'' یعنی اللہ سے ڈرنا ہے ایک غلطی ہو جانے کے بعد اور ایک غلطی کرنے سے قبل ظاہر ہے کہ ''کیئے سے ڈرنا نہ کیئے سے ڈرنے کے برابر نہیں'' ہو سکتا۔ وہ کامیاب اور برگزیدہ بندے ہیں جو غلطی ہو جانے کے خوف سے خشیّت میں رہتے ہیں اور اللہ سے پناہ مانگتے ہیں ایسے لوگوں کے کردار کے سائے میں ہی ''خیر'' پرورش پاتا ہے!

زیر نظر کرداری حوالے یعنی رجوع بالنفس کردار میں درج بالا اہم کرداری نمونوں کے علاوہ تین اور ثانوی کرداری مطابقتیں ہیں جن میں معاملہ صرف اپنے نفس سے ہی نہیں ہوتا بلکہ ان میں دیگر افراد اور سماج کے حوالے بھی شامل ہیں ان میں سے ایک کرداری نمونہ وہ ہے جو حق گوئی کا آئینہ ہوتا ہے۔

حق گوئی

حق گوئی کے معنیٰ سچ بولنے یا سچ کہنے کے ہیں ظاہر ہے کہ یہ کردار اپنے نفس سے ایک معاملہ ہونے کے علاوہ ''گفتن'' کی نسبت سے سماج اور دوسرے لوگوں سے بھی وابستہ ہو جاتا ہے یوں تو ہر شخص سچ بولتا ہے مگر سچ یہ ہے کہ کوئی بھی جو کچھ کہتا ہے سب سچ نہیں ہوتا اور پھر یہ بھی کہ ہر سچ بیان نہیں کیا جاتا۔ میرے شیخ فرماتے تھے ''سچ کہو سب مت کہو'' اسلام کا حکم بھی یہی ہے کہ لوگوں سے ان کی زبان میں (ان کی بساط واستعداد کے مطابق) بات کرو بچوں کو باتیں سمجھائی جاتی ہیں مگر انہیں فلسفہ نہیں سمجھایا جاتا ہے۔ عام سچائیاں سب کے لیئے ہیں مگر باطنی رموز وحقائق اہل اللہ کے لیئے ہیں۔

روز مرّہ کے کاروبار اور سماجی معاملات میں اگر ہم سچ نہ بولیں تو سماجی تعامل (Social Interaction) ناممکن ہو جائے اور فرد سے ربط ملت قائم ہی نہ ہو اسی لیئے ''سچ ہماری ضرورت'' ہے۔ مگر کیا کہیئے کہ ''جھوٹ ہماری مصلحت'' فریبی مصلحت!

انسان میں اپنے چھوٹے چھوٹے فانی اور عارضی مقاصد حاصل کرنے کے لیئے جھوٹ بولنے کا میلان ہے جو اسلامی اقدار و اخلاق کے حوالے سے ناپسندیدہ ہی نہیں بلکہ ''منہیات'' میں ہے۔ اس جھوٹ نے ہی انسان میں بڑی حقیقتوں کے اعتراف سے دوری پیدا کر کے اسے باطل پرست بنا دیا ہے۔ حضرت آدم سے لیکر آج تک جتنے مصلحین و صالحین آئے ہیں خواہ ان کا مذہب اور تمدن کچھ بھی ہو سب نے ہی حق گوئی کا درس دیا ہے شاید یہ واحد خیر ہے جس پر تمام حلقے متفق ہیں مگر طرفہ ستم یہ ہے کہ جتنی سچ کی تبلغ ہو رہی ہے جھوٹ اتنا ہی پھل پھول رہا ہے۔

جدید فلسفۂ جمہوریت نے کثرت رائے کو معیار ''خیر'' بنا کر ایک ستم یہ کیا ہے کہ کثرت کی بنیاد پر خیر و شر اور جائز و ناجائز کے فیصلے ہونے لگے ہیں مگر اسلامی اقدار کثرت رائے سے متعین نہیں ہوتیں اسی لیئے دور حاضر میں اسلامی اقدار کے نفاذ کی کوشش میں زیادہ رکاوٹیں پیش آ رہی ہیں اکثریت کے معیار پر حق و باطل کا جائزہ لیجیئے کیا توحید رسالت آخرت اور دیگر اقدار پر اکثریت متفق ہے قطع نظر اس کے کہ سچ کیا ہے سچ کی تبلیغ و طرفداری پر سب متفق ہیں یعنی دور حاضر میں سچ ایک تجریدی تصور بن گیا ہے کہ اس کی تائید تو نظری اعتبار سے سب ہی کرتے ہیں مگر سچائیوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں اسی لیئے معاشرہ میں افراتفری اور کج روی پیدا ہو رہی ہے کاش ہم سب اپنے نفس کو ''سچائی'' پر متفق کر کے اسے حق گوئی پر راضی کر سکیں تو اس ایک کرداری نمونے پر ہی عمل پیرا ہونے سے معاشرتی اصلاح کا کام آسان ہو جائیگا۔

راقم تو سمجھتا ہے کہ اگر ہر آدمی صرف اپنے نفس کو حق گوئی پر متفق کر لے تو سچائی کے قطرے ملکر سچائی کا سمندر بن جائینگے اور اچھے لوگوں پر مشتمل یعنی حق گو معاشرے میں نہ جھوٹی گواہیاں ہوں گی نہ دھوکہ دہی۔ نہ حق تلفی نہ جبر نہ چوری نہ زنا بلکہ پوری صداقت سے ظاہر و باطن میں صداقتیں نافذ ہو کر ایک فلاحی صالح معاشرے کی تعمیر کے کام کو آسان تر کر دینگی اس کے لیئے ''صرف میرا حق گو ہونا کافی ہے۔''

ایفائے عہد

ایفائے عہد کے کرداری نمونے کی مطابقتی اور معاشرتی اہمیت پر میں زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتا کہ یہ رجوع بالنفس کرداری نمونوں میں وہ مطابقتی

کردار ہے جو اپنے نفس کو حق گوئی پر متفق کرنے کے بعد خود ہی روبہ عمل آئے گا اس کے معنی اپنے وعدے کو وفا کرنے کے ہیں ظاہر ہے کہ راست گو جب خود سے یا کسی دوسرے فرد سے کوئی وعدہ کرتا ہے یا اللہ تعالیٰ سے عہد کرتا ہے تو وہ حق گو اور حق پسند ہونے کی بنیاد پر اس کی تعمیل کرتا ہے جس سے انفرادی اور اجتماعی کاروباری اور نجی، گھریلو اور دفتری، داخلی اور خارجی تمام اعمال قول و فعل کی ہم رنگی سے ایک صالح معاشرے کی بنیاد بن جاتے ہیں۔

پابندی اوقات

اپنے نفس کو وقت کی پابندی کا عادی بنانا بظاہر ایک معمولی اور بڑے مطابقتی اسلامی کرداری نمونوں میں بظاہر ایک کمتر اور ادنیٰ کردار یا غیر اہم سا محسوس ہوتا ہے۔ شاید دنیا کے تمام مذاہب میں اسلام نے پابندی اوقات کو جتنی اہمیت دی ہے اتنی تاکید کہیں اور نظر نہیں آتی۔ اقوام عالم میں پابندی اوقات کے حوالے سے انگریز قوم کی بڑی شہرت ہے۔ اس حقیقت سے انکار بھی نہیں کہ وہ وقت کے پابند ہیں مگر غور کیجئے کہ یہ سبق انہوں نے کہاں سے لیا ہے اس سوال کا جواب بھی یہی ہے کہ دیگر سنہری اصولوں کے طرح مغرب نے یہ اصول بھی اسلامی تہذیب سے ہی مستعار لے کر اپنی میراث بنالیا ہے۔

دیگر معاملات و ہدایت تو چھوڑ یئے خود اپنے فرائض کی ادائیگی کی جو اسلامی قدریں ہیں ان پر غور کیجئے سب سے پہلا اور اہم فرض نماز ہے جسے سختی کے ساتھ پابند وقت کیا ہے اگر اس میں وقت کی پابندی نہ کی جائے تو ''نماز قضاء'' اوقات کی پابندی پر نظر کیجئے کہ چوبیس گھنٹے کا نظام الاوقات کیا ہے فجر قبل از طلوع اشراق بعد شروق، ظہر بعد زوال، عصر قبل از غروب۔ مغرب فوراً بعد غروب،

عشاء قبل از نصف شب تہجد بعد از نصف شب ''رمضان شریف میں'' سحری کا وقت مقرر نہ کھانے کا وقت مقرر۔ افطار کا وقت مقرر۔ عیدین اور حج کے مہینے مقرر۔ حج کے ارکان کی ترتیب اور اوقات مقرر۔ مسجدوں میں اذان اور نماز باجماعت کے اوقات منٹوں کے ساتھ مقرر غور فرمایئے کہ جس قوم کو ادائے فرائض میں وقت کا اتنا پابند بنایا گیا ہو کیا اس کے نظام اخلاق و اقدار میں ''قید وقت'' سے آزادی ہوسکتی ہے مگر افسوس کہ ہماری کاہلی اور تن آسانی نے ہمیں موجب ملامت بنادیا کہ ہمارے ہاں تقریب میں دعوت کا وقت اگر نو بجے شب ہے تو گیارہ بجے پہنچتے ہیں۔ یہ بات اخلاقی اعتبار سے اور تضیع وقت سے بچنے کے لیئے انتہائی ضروری ہے کہ فرد اپنے نفس کو روح اسلامی کے مطابق پابند اوقات بنا کر زندگی کے معمولات میں نظم وضبط پیدا کرے۔

پابندیٔ اوقات کے بیان کے ساتھ ہمارے رجوع بالنفس کے کرداری نمونوں کا اختتام ہوتا ہے اس کے بعد اب ہم ان اسلامی کردار مطابقی نمونوں کی طرف آتے ہیں جن کا تعلق دیگر افراد سے معاملات یا سماجی تعامل سے ہے ان میں سب سے پہلے عدل واحسان کو لیجئے

عدل واحسان

انصاف ہر مہذب معاشرے کی بنیاد ہے اور اسلامی اخلاقی کردار کے ان نمونوں میں سب سے افضل ہے جن کا معاملہ افرادِ معاشرہ سے ہے۔ عرف عام میں تو عدل حقوق وفرائض کے صحیح تعین کے اصول کو کہتے ہیں جس معاشرہ میں انصاف کا بول بالا ہے وہاں نہ حق تلفیاں ہیں نہ جبر ہے۔ ہر ایک کو اس کا واجب حق ملتا ہے اور ہر شخص اپنے مفادات فاسدہ سے بالاتر ہو کر دوسرے کو اس کا حق

دیتا ہے۔عدل کے ہم معنیٰ ایک اور لفظ انصاف بھی استعمال ہوتا ہے اس کے معنی نصف کرنے یعنی دو برابر حصّوں میں تقسیم کرنے کے ہیں اور عدل بھی یہی مفہوم ذرا اعلیٰ تر سطح پر رکھتا ہے۔قرانِ حکیم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ۔

بے شک اللہ حکم دیتا ہے عدل اور احسان کا۔

مفسرین کے مطابق عدل کے معنی برابر کا بدلا دینا ہے اور احسان کے معنی یہ ہیں کہ خیر کا بدلا زیادہ ہو اور شر کا بدلہ کم! ایک اور شرح کے مطابق عدل کے معنی معاملات میں میانہ روی سے کام لینے کے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اگر کسی معاشرے میں ہر شخص کو اس کا حق یعنی نیکی کی جزاء بدی کی سزا برابر ملتی رہے تو وہ معاشرہ اعتدال پسند ہوگا اسلام ایسے ہی معاشرے کی تشکیل چاہتا ہے بلکہ اس سے کچھ آگے یعنی عدل سے بھی آگے 'احسان' کو پسند فرماتا ہے۔غرض یہ کہ عدل اور احسان دو ایسے کردار یا نفسیات کے مطابقتی نمونے ہیں جو دوسروں کے یا معاشرے کے حوالے کے بغیر وقوع پذیر نہیں ہو سکتے اسی لیئے راقم نے عدل و احسان کو رجوع بالعباد کرداری نمونہ قرار دیا ہے۔

عفو و ایثار

یہ کرداری نمونہ عدل سے کچھ آگے بڑھ کر احسان سے زیادہ قریب ہے یہ فرد کا وہ معاشرتی کردار ہے جہاں فرد دوسرے شخص کی برائی کے نتیجہ میں اسے سزا دینے کے بجائے معاف کر دیتا ہے۔یہ ''عفو'' ہے اور جہاں فرد اپنا حق معاف کر کے اپنے عمل کا نیک بدلا خود لینے کے بجائے دوسروں کو دیدے وہ ''ایثار''

ہے۔ یہ لفظ قربانی کے ہم معنی ہے اور قربانی بھی وہ عمل ایثار ہے جو بندوں کی خیر کے علاوہ اللہ کی خوشنودی کے لیئے بھی انجام دیا جائے ہمارے بزرگوں کا رویہ یہی رہا ہے کہ

روک لو گر غلط چلے کوئی
بخشدو گر خطا کرے کوئی

تو اپنے حق کو اپنے بجائے دوسرے کے لیئے صرف کر دینا ایثار ہے عفو میں تو فرد بدلا لینے سے دستبردار ہوتا ہے مگر ایثار میں کچھ لینے کے بجائے اپنے پاس سے کچھ دیتا ہے اور خود کو محروم رکھتا ہے اگر خود کو محروم رکھ کر دوسرے کو نوازنے کا عمل عام ہو جائے تو یہ معاشرے کی اعلیٰ تشکیل کا کلیدی نقطہ ہے۔ کسی بھی صورت حال کو دیکھیں ہر جگہ جھگڑا فساد اور جنگ و جدل (سوائے جہاد) کچھ حاصل کرنے یا کچھ بچانے کے لیئے ہوتا ہے اگر فرد اس نفسیاتی دباؤ سے آزاد ہو کر اپنے وسائل سے دوسروں کی حاجت روائی کے کردار کو اپنا لے تو فساد کی جڑ ختم ہو جاتی ہے اور معاشرے کا ہر فرد خواہ وہ غریب ہو یا امیر مطمئن ہو کر پر سکون زندگی گذار سکتا ہے۔

جود و سخا

یہ سماجی کرداری نمونہ جسے دو لفظوں سے بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ رجوع بالعباد کردار کی ہی ایک شکل ہے کہ سخاوت کا عمل اپنے نفس کے لیئے ''اسراف'' بن جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ ممکن نہیں کہ وہ لا احتیاج اور ضرر و نفع سے بالاتر ہے۔ سخاوت دراصل خِسّت کا متضاد عمل ہے خِسّت کے تحت فرد اپنی دولت ضروری مواقع پر بھی خرچ نہیں کرتا اور جو خرچ کرتا ہے وہ مقدار مطلوبہ سے کم ہوتی ہے اس بخل و خِسّت کے برخلاف عمل کو اگر دوسروں کی خیر کے لیئے کیا

جائے تو جود وسخا ہے اور اپنے لیئے اسراف ہے جود کے معنی بخشنے کے ہیں اور اللہ تعالیٰ سب سے بڑا بخشنے والا ہے اسی لیئے وہ جوّاد ہے انسان چونکہ اللہ کا خلیفہ ہے اسلیئے وہ بھی بعض صفات سے خود کو متصف کرنا چاہتا ہے وہ خدائی صفات اپنانا جن سے احتمال شرک نہ ہو پسندیدہ عمل ہے ''جود'' ایسی ہی صفت ہے اور یہ جود و سخا کا عمل صوفیاء واولیا کا پسندیدہ شغل رہا ہے اگر اس حوالے سے ہم بھی اپنے بزرگوں کی اتباع کرنے لگیں تو ہم حرص وہوس سے بالاتر شخصیت کی تعمیر کی معرفت اسلامی معاشرے کی تشکیل میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں مگر میں پھر وہی حقیقت دوھراؤں کا کہ ہر کار خیر کے لیئے عقیدہ آخرت کا احساس میں جاگزیں ہونا ضروری ہے۔

خوش خُلقی

لفظی معنی تو اچھے اخلاق کے ہیں مگر وسیع تر مفہوم میں یہ اسلامی اخلاق و اقدار کا حامل کرداری نمونہ ہے مگر مرادی معنی میں یہ ایک ایسا رجوع بالعباد کردار ہے جس سے دوسرے کی تالیف قلب ہو اور وہ خواہ امیر ہو یا غریب اس کردار کی وجہ سے آپ سے ملنا اور قربت چاہے عرف عام میں نرم گفتاری عجز وانکساری۔ دوسرے کی عزت افزائی کا کلام۔ سلام مصافحہ اور معانقہ میں پہل ہمدردی و معاونت اس کرداری نمونے کے خاصّے ہیں درحقیقت اسلامی درس کا مآل یہی ہے کہ وہ لوگوں میں نیت کے حوالے سے خیر خواہی اور کردار کے حوالے سے حسن عمل چاہتا ہے ایسا کردار فرد کے ظاہر و باطن کی پاکیزگی اور بے لوثی کا آئینہ دار ہے میں جب بھی خوش خلقی (عجز وانکسار) کے حوالے سے سوچتا ہوں تو مجھے اپنے تین اساتذہ ہمیشہ یاد آتے ہیں۔ مولانا مظہر علی کامل جو ''اتحاد مسلمین'' حیدرآباد

دکن کے صدر تھے۔ دوسرے حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان جونقشبندیہ سلسلہ کے معروف بزرگ تھے اور تیسرے مولانا منتخب الحق صاحب جو سید سلمان ندوی سے تلمذ خاص رکھتے تھے اور سید صاحب کی پسندیدہ شخصیت تھے مجھے ان شخصیتوں سے نسبت پر فخر ہے اور ان سے کسب اخلاق پر شکر گذار ہوں اللہ تعالیٰ ہم سب کو اسلامی کردار و معاشرے کی تعمیر میں اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چلنے اور ان سے کسب فیض کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

خیر خواہی

سطور بالا میں جس خوش اخلاقی کے کرداری نمونے کی تصویر کشی کی گئی ہے اس کے لیئے عمل ظاہرہ کا تحریک باطنی سے ہم آہنگ ہونا ضروری ہے جب ''خوش خلقی'' کے سوتے شخصیت کے باطن سے پھوٹنے لگتے ہیں تو اس میں خیر خواہی کا رویہ پیدا ہوتا ہے جو عمل ظاہرہ میں ڈھل کر ایک رجوع بالعباد و کردار بن جاتا ہے کہ اس سے بغیر تفریق پوری نوع انسانی فیض یاب ہوتی ہے وہ ابن خلدون کی پسندیدہ عصبت سے بھی بالا ہو کر نعرۂ زن ہوتا ہے۔

''کل کی خیر کل کا بھلا''

سنی ہوئی اور کتاب میں پڑھی ہوئی باتوں سے قطع نظر میں نے اس رویہ کا عملی نمونہ دیکھا ہے۔ قادریہ سلسلے کے ایک بزرگ کامل جو کم گفتن و کم خوردن و کم خفتن کی ایسی تصویر تھے کہ انہیں دیکھے بغیر ان کا تصور ناممکن ہے ایک دن اچانک سکوت توڑ کر گویا ہوئے اور مجھ سے فرمانے لگے کہ'' میری نظر میں تو اب ہندو مسلمان اور اچھے برے کی تفریق نہیں رہ گئی'' میں ان جیسے متقی بزرگ سے یہ کلمہ

سن کر حیران رہ گیا۔ اور سوچتے سوچتے آخر اس نتیجہ پر پہنچا کہ جب فقیر نفسانی منزلوں کو عبور کر کے روح بن جاتا ہے تو اچھی بری تمام عصبتیں دم توڑ جاتی ہیں۔ ویسے یہ رویّہ تو کاملین کا ہے اور خال خال ہے مگر ایک مسلمان بھی جسے توفیق ایمان حاصل ہے کسی کی برائی نہیں چاہتا کل کی خیر مانگتا ہے۔ اس کرداری نمونے کے حامل افراد تو کم ملتے ہیں مگر اس اصول سے اکتساب کر کے خیر کرنے والوں کی نظر میں خیر خواہی انسانی سطح پر بلکہ اس سے کچھ آگے یعنی ہر جاندار کے لیئے پیدا ہو جاتی ہے۔ اپنے وسیع تر مفہوم میں خیر خواہی ''امت مسلمہ'' کے لیئے حضور اکرم ﷺ کا ورثہ ہے۔ آپ ﷺ خیر الانام، رحمت اللعالمین اور شفیع المذنبین ہیں حشر میں مختلف امتیں شفاعت کی التجا کرتی ہوئی آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گی اور آپ تمام ہی گنہگاروں کی شفاعت فرمائینگے۔ سب کے لیئے خیر خواہی کے معنی یہ ہرگز نہیں ہیں کہ اپنوں اور غیروں میں تفریق ہی یکسر ختم ہو جائے اور پاسِ مدارج ہی نہ رہے خیر خواہی کے معاملے میں اوّلین حق دار اقارب ہیں اور قرب کی بنیاد پر ذاتی معاملات میں امتیاز کر کے اولیت دینا اسلامی اقدار کے منافی نہیں بلکہ از روئے استحقاق اقارب افضل ہیں بر بنیاد قرب اقارب کی افضلیت کو صلہ رحمی کہتے ہیں۔

صلہ رحمی

اس اصطلاح میں رحم کا حوالہ ترحم نہیں ہے بلکہ یہاں یہ لفظ ''رحم بہ معنی بچہ دانی'' استعمال ہوا ہے جس میں بعد حمل بچہ نشو ونما پاتا ہے۔ رحم کے اسی حوالے سے فرد کا قریب تر رشتہ ''ماں'' سے ہے۔ بخاری و مسلم کی حدیث شریف ہے کسی نے دریافت کیا نیک سلوک اور اچھے برتاؤ میں کس کو مقدم کرنا چاہیئے۔ فرمایا ماں

کو۔سائل نے کہا پھر کس کو؟ فرمایا ماں کو۔تین مرتبہ ماں کا ذکر کرنے کے بعد چوتھی مرتبہ فرمایا باپ کو ظاہر کہ بچہ رحم مادر میں نشو ونما پاتا ہے ماں اسے نو ماہ اپنے شکم میں رکھتی ہے مگر یہ بھی ہے کہ وہ رحم میں آیا باپ کی وجہ سے اس لیئے ''صلہ رحمی'' میں دوسرا اہم فرد باپ ہے ترمذی کے مطابق ''اللہ تعالیٰ کی رضا مندی''باپ کی رضا مندی'' میں مضمر اور پوشیدہ ہے احادیث کی رو سے۔''جنت ماں کے قدموں میں ہے اور اللہ کی رضا باپ کی رضا میں'' صلہ رحمی کے حوالے سے والدین کے بعد بہن بھائیوں کا درجہ ہے کہ وہ ایک ہی ''شکم و آغوش'' سے ہیں ایک قدم اور آگے بڑھیے تو ازواجی رشتہ بھی رحم کا رشتہ ہے اور اسی حوالے سے ماں باپ اور بہن بھائیوں کے ساتھ بیوی بچے میں صلہ رحمی کے حق سے محروم نہیں ہیں۔ظاہر ہے کہ جب معاشرے کا ہر فرا اپنے ماں باپ بہن بھائی اور بیوی بچوں کو ادائے حقوق میں افضلیت دے کران کی خدمت اس طرح کرنے لگے گا کہ کسی حقدار کا حق نہ مارا جائے تو پورا معاشرہ سدھر جائے گا۔

اُس سحر کے شام کے اور فیضِ ساقی کے نثار
اس چمن کی آرزو ہے ان بہاورں کا خمار!

ایک خیال

بالغ نظری سے دیکھیں تو قرآنی اور مسنون دعاؤں کے علاوہ ہماری ہر دعا اللہ کی رضا کو اپنی رضا کے مطابق کرنے کی آرزو ہے

مولانا حسرتؔ موہانی نے کیا خوب کہا ہے۔

مرضیٔ یار کے خلاف نہ ہو
لوگ میرے لیئے دعا نہ کریں

(مصنف)

چوتھا باب

اسلام اور فرد کا معاشی کردار

اسلام اور فرد کا معاشی کردار

جب فرد اپنی نفسیاتی نشوونما کے ابتدائی مدارج طے کرنے کے بعد ''خود کفالت'' کی منزل پر پہنچتا ہے تو اسے زندگی کے دیگر مسائل کے ساتھ جس مسئلے سے بطور خاص نمٹنا پڑتا ہے وہ اس کا معاشی کردار ہے اس کردار کی نوعیت متعین کرنے میں بھی اسلام نے سکوت اختیار نہیں کیا بلکہ اپنے اعتقادی اور اخلاقی نظام سے ہم آہنگ صرف و پیدائشِ دولت کے مسائل بھی انسانی کردار کے حوالے سے واضح کیئے ہیں۔ انسانی کردار کے معاشی پہلو کی ماہیت سمجھنے کے لیئے ہمیں حیوانی زندگی پر بھی نظر کرنی ہوگی کہ انسان بھی نامیاتی نسبت سے بہت سی حیوانی خصوصیات کا حامل ہے۔

حیوانی زندگی

چھوٹے بڑے جتنے بھی حیوان ہیں ان کے ساتھ قدرت نے بعض ایسی ''ضروریات'' وابستہ کردی ہیں جن کی تسکین کے بغیر زندگی کا جاری رہنا ممکن نہیں ان ضروریات کو عضویاتی ضروریات کہتے ہیں یہ درج ذیل ہیں۔

۱۔ بھوک
۲۔ پیاس
۳۔ نیند
۴۔ آرام (تکان)
۵۔ جنسی تسکین

مندرجہ بالا میں اول چار اپنی بقا و پرورش اور صحت کے لیئے اور آخری بقائے نسل کے لیئے زیادہ اہم ہے۔

قدرت نے جہاں حیوان کے اندر یہ ضرورتیں رکھی ہیں وہیں ان کی تسکین کے لیئے اس کے ماحول میں وسائل اور ذرائع بھی فراہم کردیے ہیں چرندوں کے لیئے گھاس پھونس۔ پرندوں کے لیئے دانہ دنکا۔اور درندوں کے لیئے (گوشت) شکار کی فراہمی کا انتظام کردیا ہے۔حیوانی زندگی اس لحاظ سے انسانی زندگی کے لیئے قابلِ رشک ہے کہ حیوانات کی عضویاتی ضروریات کی تسکین کے لیئے فراہم کردہ ذرائع اور وسائل وافر ہیں کہ جن سے استفادہ کرنے کے لیئے ہر حیوان کو معمولی اور معتدل درجہ کی تگ و دو کرنی پڑتی ہے اور اس کی ضروریات کی تسکین ہو جاتی ہے۔

انسانی زندگی

انسانی زندگی ڈارون کے نظریہ ارتقاء کے مطابق اپنی اساسی تعریف میں حیوانی ہے مگر اسلامی نظریہ کے مطابق ہر انسان آلِ آدم ہے بایں ہمہ اس حقیقت سے انکار نہیں کہ اس میں بھی وہ تمام عضویاتی ضروریات موجود ہیں جو ادنیٰ سطح کی حیوانی زندگی میں ملتی ہیں مگر صرف اتنا ہی نہیں اس سے تھوڑا آگے بڑھیئے تو انسانی زندگی میں عضویاتی ضروریات کے علاوہ کچھ دیگر ضرورتیں بھی نظر آتی ہیں مثلاً ستر پوشی اور لباس کی ضرورت آدم اور حوا کو بھی لاحق ہوئی جو آلِ آدم کی بھی ضرورتوں میں اہم ہے مگر یہ کہ اس کی نوعیت نیم حیاتی (گرم و سرد سے بچاؤ) اور نیم سماجی ہے انسانی زندگی کے تدریجی ارتقا نے اس کی ضروریات میں اضافہ کر کے ''وسائل و حاجات'' کا توازن خراب کردیا اور حاجتیں زیادہ اور وسائل کم ہو گئے

ہیں نتیجۃً انسان کو لامحدود حاجات اور محدود وسائل میں توازن پیدا کرنے کے لیئے ایسی جدوجہد کرنی پڑی جس کی شہادت حیوانی زندگی میں نہیں ملتی

معاشی جدوجہد

مندرجہ بالا نوع کی جدوجہد کو ''معاشی جدوجہد'' کا نام دیا گیا ہے ہر انسان خواہ کسی تہذیب مذہب یا علاقے سے تعلق رکھتا ہوا پنی لامحدود ضروریات اور محدود وسائل میں توازن کی کشمکش کا شکار ہے۔ نیز یہ کہ بعض ضروریات خالص انفرادی نوعیت کی ہیں مثلا روٹی کپڑے اور مکان کی ضرورت اور بعض کی نوعیت اجتماعی مثلاً صنعت وحرفت، قومی آمدنی اور بین الاقوامی تجارت وغیرہ جدید سائنسی معاشیات اجتماعی معاشی جدوجہد کا معروضی (objective) مطالعہ ہے اس میں نہ تو انفرادی معاش یا انفرادی کسب کا حوالہ ملتا ہے اور نہ ہی یہ مدّات خرچ کے انفرادی تعین میں جائز و ناجائز کے مسائل سے بحث کرتی ہے یعنی اس کی نوعیت ''معیاری'' (Normative) نہیں ہے۔ ''یہ ایک باقاعدہ معروضی اصولی تجزیاتی علم ہے۔''

مندرجہ بالا سے اگر اسلامی معاشی کردار کا موازنہ کیا جائے تو اس میں جدید سائنسی معاشیات کے مقابلے میں دو ایسے حوالے ملتے ہیں جو اسلامی معاشی کردار کو روزمرّہ کے معمولات اور انفرادی معاشی مشاغل سے وابستہ کر دیتے ہیں یعنی اسلامی معاشیات کا موضوع بحث سائنسی معاشیات سے درج ذیل دو حوالوں کی نسبت سے بسیط تر ہے۔

☆ اسلامی معاشیات مدّات صرف میں جائز و ناجائز کے وہ قوانین و معیارات بھی پیش کرتی ہے جو جدید معاشیات کی حدود سے باہر ہیں۔

☆ نیز یہ کہ اسلامی معاشیات صرف اجتماعی حوالے سے ہی نہیں بلکہ انفرادی اور نجی حوالوں سے بھی بحث کرتی ہے کہ ''صرف و پیدائشِ دولت'' کے حوالے سے فرد کا انفرادی کردار کیا ہونا چاہیئے یہ عنوان سائنسی جدید معاشیات کی حدود میں شامل نہیں ہے۔

چنانچہ مباحث اور وضاحتوں میں اسلامی معاشی کردار پر ان دونوں حوالاجات سے روشنی ڈالی جائیگی اور اختصار کے ساتھ اس انفرادی معاشی کردار کی شبیہ پیش کی جائے گی جو اسلام کے اعتقادی اور اخلاقی نظام سے ہم آہنگ ہے۔

وسائل کی عدم مساوی تقسیم

اسلامی معاشی نظام اور جدید معاشیاتی سائنس دونوں ہی اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ آفاقی سطح پر جو وسائل دستیاب ہیں بنی نوع انسان میں ان کی تقسیم غیر مساوی اور از روئے اسلام غیر منصفانہ ہے۔

امراء کے طبقہ میں وسائل کی بھر مار اور ریل پیل ہے جو ان میں تعیش کا میلان پیدا کرتی ہے۔

غربا میں افلاس و ناداری ہے جو انہیں فاقہ کشی بلکہ خودکشی پر مجبور کرتی ہے۔

یہ تقسیم بلکہ غیر مساوی تقسیم نظام کائنات کا خاصۂ فطری ہے یا انسان کی ہوس زرگری ور زرداری نے یہ صورت احوال پیدا کی ہے اس ضمن میں اسلام کے اخلاقِ معیشت کے حوالے سے دونوں حوالے ملتے ہیں وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر مہربان ہے اور وہ جتنا چاہتا ہے انہیں رزق بے حساب دیتا ہے دوسرا

حوالہ یہ ہے کہ ہم بعض کو وافر رزق دیتے ہیں اور بعض کو ناپا تلا...... ان دونوں حوالوں میں یہ اشارہ کہیں نہیں ہے کہ مشیّت نے بعض انسان بغیر رزق کے بھی پیدا کیئے ہیں ایسے افراد جو معاشرے میں نظر آتے ہیں وہ انسانی ہوس زرداری کی پیداوار ہیں کہ ان کا حق طاقت کے بل پر غصب کرلیا گیا ہے۔

مندرجہ بالا صورت حال کے تدارک کے لیئے جدید معاشیات کا کوئی واضح نظام نہیں سوائے اس کے کہ وہ آجر واجیر کے باہم تعلقات کی شرح کرتے ہوئے مزدور کے حقوق کے تحفظ کا درس دیتی ہے یا پھر سوشلسٹ معاشی فکر خونی انقلاب کے ذریعہ سرمایہ داری ختم کر کے اپنا نظام نافذ کرنا چاہتی ہے۔ اسلامی معاشی فکر اس بہیمیت کے حق میں نہیں ہے اسلام نے اس عدم مساوی تقسیمِ دولت کو متوازن کرنے کے لیئے اپنے اخلاقی معاشی نظام میں دو ایسی تدابیر وضع کی ہیں جن سے انقلاب نہیں بلکہ ارتقاء کے ذریعہ عدم مساوت کم یا ختم ہونے کے امکانات ہیں یہ دو تدابیر حسب ذیل ہیں

☆ نمبر ایک وہ اقدام جس سے اہل زر کی مجموعی دولت کے مساوی رقم یا دولت ۴۰ سال میں غرباء کے طبقہ میں منتقل ہوسکتی ہے یہ تدبیر یا اصول ''زکوٰۃ'' کا نفاذ ہے۔

☆ نمبر دو وہ اقدام جس کے ذریعہ غربا کی دولت امراء کے طبقہ میں منتقل ہونے کا سد باب کر دیا گیا ہے یعنی ''حرمت سود'' سود غربا کی پونجی امراء میں منتقل ہونے کا اہم ذریعہ ہے کہ غریب مہاجن سے سود پر قرض لے کر اپنی ضروریات پوری کرتا ہے اور مآل کار بہ شکل سود اپنی دولت کا ایک بڑا حصّہ امراء کے طبقہ میں منتقل کر دیتا ہے۔

دو پہلو

نمبر۱: اسلام میں فرضیت زکات اور حرمت سود دو ایسے اہم اسلامی معاشی اقدام ہیں جن سے تفاوت دولت میں روز افزوں کمی آسکتی ہے اور مآل کار ایک ایسا معاشرہ وجود میں آسکتا ہے جس میں امراء کے تعیش اور غرباء کے افلاس میں کمی پیدا ہوکر معاشرہ ہموار معاشی بنیاد پر استوار ہوسکتا ہے۔

نمبر۲: دوسرا مفروضہ جس پر جدید معاشیات کی بنیاد ہے یہ ہے کہ ''ضروریات لامحدود اور وسائل محدود ہیں'' اگر اس مفروضہ کو اپنی اصل میں درست تسلیم کرلیا جائے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ غربت مشیّت کی پیدا کردہ ہے جبکہ راقم اسلامی فکر کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے یہ رائے رکھتا ہے کہ قدرت نے کسی کو اپنے عطیات سے محروم نہیں رکھا۔ یعنی وسائل حاجتوں سے کم پیدا نہیں کیئے ارشاد ہے کہ ''زمینوں اور آسمانوں میں جو کچھ ہے سب تمہارے لیئے مسخر کردیا گیا۔'' مگر انسان نے اس تسخیر شدہ مواد سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ جو کچھ انسان کی رسائی میں آبھی گیا اسے معاشی فلاح کے بجائے اسٹار وار پروگرام کی نذر کرکے ''اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ'' کی منزل کو قریب لانے کی کوشش کی گئی۔ اس ضمن میں روس نے خلائی دوڑ سے نکل کر اپنی گرتی ہوئی معیشت کو سہارا دینے کے لیئے قابل تحسین اقدام کیا۔ مگر امریکہ اور اسرائیل نہ صرف اپنے وسائل جنگی تیاریوں پر صرف کرر ہے ہیں بلکہ ایران جیسے مستحکم معیشت والوں کو بھی اپنے وسائل جنگی تیاریوں پر صرف کرنے لیئے مجبور کرر ہے ہیں۔ اگر یہ تمام وسائل عالمی غربت کے ختم کرنے پر استعمال ہوتے تو وسائل کے محدود اور احتیاجات

کے لامحدود ہونے کا فرضیہ غلط ثابت ہو جاتا جنگی تیاریاں کرنے والے ممالک کے علاوہ سعودی عرب اور لیبیا جیسے مستحکم معیشت کے مسلم ممالک نے بھی عالمی افلاس کے تدارک کے لیئے بڑے اقدام نہیں کئے۔ غریب ممالک کو سود پر قرضے فراہم کرنا ان کے ساتھ دوستی نہیں دشمنی ہے۔ عرض مدعا یہ ہے کہ اگر وسائل کا حقیقی مثبت صرف کیا جائے تو احتیاجات کے لامحدود اور ذرائع کے محدود ہونے کا مفروضہ غلط ثابت ہوسکتا ہے اور عالمی افلاس وغربت سے نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔ اگر مغربی ترقی یافتہ ممالک اسلام قبول نہ بھی کریں صرف ''فرضیت زکوٰۃ اور حرمت سود'' کے اصول اپنالیں تو بایں ہمہ عالمی معیشت مثبت بنیادوں پر استوار ہوسکتی ہے۔

اسلامی معاشی کردار کے انفرادی حوالے

یہ ایک ایسا عنوان ہے کہ جس پر جدید معاشیات نے کوئی خاص توجہ نہیں دی یعنی یہ کہ پورے معاشرے اور حکومت سے قطع نظر انفرادی طور سے ہر فرد کا انفرادی کردار کیا ہونا چاہیئے؟ قدرت نے ہر انسان کو بعض ایسی صلاحیتوں سے مزّین کیا ہے جن کے استعمال سے وہ اپنی حاجتوں کی تکمیل کے لیئے کسب معاش (پیدائش دولت) کرسکتا ہے کوئی پھاوڑا اور ہتھوڑا چلا کر کوئی قلم چلا کر کوئی زبان چلا کر اور کوئی خود چل پھر کر کسب معاش کی سہولت حاصل کرتا ہے اسلام نے اس ضمن میں بعض حرام اشیاء کی تجارت کے علاوہ انتخاب پیشہ کی آزادی دی ہے اور کسب حلال کی ذمہ ذاری فرد پر عائد کی ہے۔ یہاں کسب حلال کی اصطلاح قابل تشریح ہے اور اس کے لیئے کسب و پیدائش دولت کے وہ اصول بیان کرنے ضروری ہیں جو اسلام کے اعتقادی و اخلاقی نظام سے ماخوذ ہیں۔

نمبر۱ فرد کو انتخاب پیشہ کا اختیار ہے۔

نمبر۲ محنت اور مزدوری سے حاصل کی ہوئی دولت حلال ہے۔

نمبر۳ وہ کسب یا دولت حلال ہے جسے دباؤ ڈال کر حاصل نہ کیا گیا ہو۔

نمبر۴ وہ دولت جائز ہے جس میں فریب سے کام نہ لیا گیا ہو۔

نمبر۵ وہ دولت جس میں آئندہ فساد کا امکان نہ ہو

نمبر۶ وہ دولت جو کسی کا حق مار کر حاصل نہ کی گئی ہو۔

نمبر۷ وہ دولت جو سرمایہ پر پیشگی طے شدہ شرح سے نہ لی گئی ہو۔

جائز آمدنی کے مندرجہ بالا اصول مولانا سید منتخب الحق صاحب نے راقم سے اسی موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے بیان فرمائے تھے اور اسی طرح انفرادی مدات خرچ کے بھی چار اصول بیان کئے تھے جو حسب ذیل ہیں۔

۱۔ صرف دولت میں اسراف نہ ہو۔

۲۔ صرف دولت میں تبذیر نہ ہو۔

۳۔ صرف دولت میں بخل نہ ہو۔

۴۔ صرف دولت میں تقطیر نہ ہو۔

مولانا صاحب کی وضاحت کے مطابق ''اسراف کے معنی مناسب موقع پر مگر مطلوبہ مقدار سے زیادہ خرچ کرنے کے ہیں اور تبذیر کے معنی ایسی جگہ اور ایسے محل پر خرچ کرنے کے ہیں جہاں خرچ لازم نہ'' ہو دونوں

اصول ''ضرورت سے زیادہ خرچ کو منع کرتے ہیں''۔ اسی طرح ضرورت پر خرچ نہ کرنا بھی منع ہے۔ ''جہاں خرچ کرنا چاہیئے اس عمل اور موقع پر خرچ نہ کرنا بخل ہے اور جتنا خرچ کرنا چاہیئے اس سے کم مقدار میں خرچ کرنا تقطیر ہے''۔ چنانچہ اسلام جو خود ایک اعتدال پسند مذہب ہے خرچ کرنے اور نہ کرنے دونوں حوالوں سے انتہا پسندی کے خلاف ہے۔ اگر مندرجہ بالا چاروں اصول کو روز مرہ زندگی کے معمولات میں شامل کرلیا جائے تو اس سے انفرادی صرف دولت کا بہترین نمونہ تشکیل پاتا ہے۔ اب رہا یہ کہ کونسے محل خرچ کے لیئے مناسب ہیں اور کونسے نا مناسب اس کی فہرست ترتیب نہیں دی جاسکتی مناسب اور نا مناسب محل کا تعین فرد کی سماجی حیثیت اور معاشرتی اقدار سے ہوتا ہے۔ اسی طرح خرچ یا صرف کی مقدار کا تعین بھی فرد کی اپنی معاشی حیثیت اور ضرورت وقت کے مطابق ہوتا ہے اگر خرچ ضرورت سے کم یعنی تقطیر کی جائے تو یہ کسی نہ کسی کی حق تلفی ہے اور اگر محل پر خرچ نہ کیا جائے گا تو بھی کوئی نہ کوئی محروم رہے گا۔

اگر درج بالا چاروں اصول اپنا کر صرف اور پیدائش یا کسب دولت کے ساتوں اصول اپنا کر کمائی کی جائے تو اس سے مرتب ہونے والا فرد کا کردار بہترین ''اسلامی انفرادی معاشی کردار'' ہوگا۔ جس میں پورے معاشرے کی معاشی فلاح کا راز مضمر ہے۔

چند خصوصی انفرادی مدات خرچ

جہاں تک جدید معاشیات کا تعلق ہے تو وہ انفرادی سطح پر کسی معاشی جدو جہد یعنی کسب یا صرف دولت کے قوانین بیان نہیں کرتی مگر اسلامی معیشت

انفرادی زندگی میں بھی بعض مدّات خرچ لازم اور بعض ممنوع قرار دیتی ہے۔ اگر نفسیاتی نظر سے دیکھا جائے تو فرد ہی معاشرہ کی بنیادی فعال اکائی ہے فرد کے سنبھلنے سے معاشرہ سنبھلتا ہے اور اس کے بگڑنے سے بگڑتا ہے تاریخ اسلام گواہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے افراد ہی بنائے جنکے بننے سے معاشرہ خود بن گیا۔ معاشرہ خلا میں واقع نہیں ہے وہ انفرادی اکائیوں کا ہی مجموعہ ہے اگر کسی معاشرے کے افراد اچھے ہیں تو معاشرہ بھی اچھا ہوگا چنانچہ اسلام نے اپنے معاشی نظام میں بھی فرد کو ہی اہمیت دی ہے وہ فرد ہی ہے جس سے حساب کتاب کیا جائے گا جو رحم مادر میں بھی آغوش مادر میں بھی زندگی میں بھی قبر میں بھی اکیلا ہے اس پر معاشرتی کردار نہیں بلکہ اپنا انفرادی کردار سنبھالنے کی ذمہ داری عائد کی گئی ہے۔ ایمان۔ اخلاق۔ زہد، تقویٰ عبادات۔ شکر۔ صبر۔ توکل۔ فقر سب انفرادی کردار کے ہی متقاضی ہیں چنانچہ اسلامی معاشی نظام میں بھی پورے معاشرے کے فلاحی کردار کی بنیاد انفرادی کردار پر رکھی گئی ہے اور فرد کے لیئے بعض خصوصی کرداری نمونے لازم کیئے گئے ہیں جن سے معاشرتی، معاشی فلاح کی تشکیل ہوتی ہے ان میں سے چند اہم حسب ذیل ہیں ان میں ایک منفی حکم یعنی ''نہی'' ہے اور باقی اوامر کی تعریف میں آتے ہیں ہم سب سے پہلے اس منفی حکم پر گفتگو کرینگے جس کا سرسری حوالہ گذشتہ سطور میں بھی دیا گیا ہے۔ اس منفی حکم میں انفرادی کے ساتھ اجتماعی کردار کے بھی بعض پہلو پنہاں ہیں۔

سود

سود کے لفظی معنی فائدہ کے ہیں اور اس کی ضد ''زیاں بہ معنی نقصان ہے''
علامہ اقبال نے ایک جگہ کہا ہے۔

''فریب سود'' زیاں لَآاِلٰـہَ اِلَّااللّٰــہُ

اصطلاحی معنوں میں سود اس زاید رقم کو کہتے ہیں جو پیسہ قرض دیکر اس پر پیشگی شرح مدت کے تعین سے حاصل کی جائے۔ اس طرح پیسے سے پیسے کمانا اسلام نے حرام قرار دیا ہے۔ اس طریقہ کا رواج قدیم ہے۔ ساہوکار اور مہاجن غربا کی ضرورتوں پر انہیں اسی شرط پر رقم فراہم کرتے تھے چنانچہ سود کی ادائیگی سے نادار مزید مفلس ہو جاتا تھا اور اس طرح غربا کی جو کچھ پونجی تھی وہ بھی امیر طبقہ کو منتقل ہو کر دولت کی غیر مساوی تقسیم کے مسائل میں مزید اضافہ کرتی تھی چنانچہ اسلام نے اپنے معاشی نظام سے ایسے کاروبار کو خارج کر کے یکسر ناجائز بلکہ حرام قرار دیا جبکہ دور حاضر کی جدید معاشیات کی بنیاد ہی سودی کاروبار ہے جس سے غریب مزید غریب اور امیر مزید امیر ہو رہا ہے۔

یہ سودی کاروبار انفرادی اور اجتماعی ہر سطح پر درج ذیل تین شکلوں میں جاری وساری ہے۔

اول: فرد اور فرد کے درمیان

دوم: فرد اور ادارے کے درمیان

سوم: ادارے اور ادارے کے درمیان

موجودہ بین الاقوامی معیشت کی رو سے امیر ممالک اور حکومتیں غریب ممالک کو سود پر قرض دیکر بظاہر تو معاونت کر رہی ہیں مگر اس طرح غریب ممالک قرضہ میں جکڑ کر ترقی یافتہ ممالک کے ہاتھوں نظریاتی اور سیاسی لحاظ سے یرغمال ہوتے جا رہے ہیں۔ پاکستان سمیت پوری تیسری دنیا سودی لین دین کے حوالے

سے مالدار ممالک کی غاشیہ بردار ہوتی جارہی ہے۔ غریب دنیا کے لیئے سودی کاروبار ایٹمی حملے سے زیادہ تباہ ناک ہے مگر یہودی لابی اس کے نتائج سے پوری طرح آگاہ ہونے کے باوجود اپنے مسموم ارادوں میں سرگرم ہے۔ اسلام نے اب سے چودہ سو سال قبل اس لعنت کے مابعد اثرات سے افراد کو بچانے کے لیئے سود حرام کردیا تھا مگر مسلم امہ بہ مجبوری اس حوالے سے کمزور اعتقاد کا مظاہرہ کر کے سود پر بین الاقوامی قرضے حاصل کررہی ہے۔

اب سے چوتھائی صدی قبل تک یہودی فکر نے یہ پروپیگنڈا کیا ہوا تھا کہ بین الاقوامی تجارت اور خاص کر ''بینک کاری'' بغیر سود کے ممکن ہی نہیں ہے مگر گذشتہ دو دہائیوں میں اسلامی فکر رکھنے والے ماہرین نے ''اسلامی بینک کاری نظام'' قائم کر کے یہودی غبارے سے ہوا نکال دی ہے مگر اوسط بلکہ پست ذہن صرف نفع کی شراکت چاہتا ہے نقصان کی شراکت کے لیئے تیا نہیں ہے۔ امید ہے کہ آئندہ سالوں میں اسلامی بینکاری پر لوگوں کا اعتماد بحال ہوگا اور ترقی پذیر اسلامی ممالک سودی قرض سے بھی اپنی گردن آزاد کرالیں گے۔

اسلام نے اپنے معاشی موانع میں سود کے علاوہ جوئے اور سٹہ کی بھی ممانعت کی ہے مگر سٹہ تو اب کاروبار سے بڑھ کر کرکٹ کے میدانوں تک پہنچ گیا ہے۔ یہ سب خرابیاں بنیادی طور پر اپنے اعتقاد کی اور خاص کر عقیدۂ آخرت کی کمزوری کا نتیجہ ہیں'' کاش ہمیں اسلاف کا سوز و دارں حاصل ہو سکے کہ ہم متاع غرور کے سودے سے دور رہیں۔''

مندرجہ بالا سے آگے بڑھ کر اب ہم ذیل میں چند ایسے مثبت معاشی اقدام پر گفتگو کرینگے جن پر عمل پیرا ہونے سے دنیا اور آخرت دونوں سنبھل سکتی ہیں۔

زکوٰۃ

زکوٰۃ دراصل امراء کی دولت میں غربا کا حصّہ ہے جو اللہ کی جانب سے نصاب کے چالیسویں حصّہ کے برابر ہے زکات کی فرضیت کا مقصد سود کی حرمت کے حکم سے ہم آہنگ ہو کر دولت کی غیر مساوی تقسیم کے خلاف جہاد ہے۔ سود کی حرمت کے ذریعہ غربا کی پونجی امراء کے حوالے ہونے سے بچائی گئی ہے اور زکوٰۃ کے ذریعہ امراء کی دولت کا غرباء میں منتقل ہونا لازم کیا گیا ہے اگر ان دونوں احکام یعنی فرضیت زکوٰۃ اور حرمت سود پر عمل کیا جائے تو تفاوتِ دولت میں کمی آسکتی ہے۔

زکوٰۃ کی اہمیت

زکوٰۃ کی اہمیت کا اندازہ صرف اس بات سے ہی لگایا جاسکتا ہے کہ اس کی فرضیت کا حکم قرآن پاک میں نماز کی فرضیت کے ساتھ ہے اور حکم تکرار سے دیا گیا ہے۔ نیز یہ کہ زکوٰۃ ادا نہ کرنے کے عذاب کا بھی حوالہ بارہا دیا گیا ہے ایک حدیث شریف کے مطابق زکوٰۃ ادا نہ کرنے والے کی نماز بھی مقبول نہیں۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے فتوے کے مطابق منکر زکوٰۃ سے جہاد لازم ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ منکر زکوٰۃ دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ یہاں تارک اور منکر کے فرق کو ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ ''ترکِ فرض گناہ ہے اور انکار کفر ہے'' اللہ کے نام پر زکوٰۃ ہی نہیں اور مماثل معاشی اقدام مثلاً صدقات اور انفاق بھی اہم نوعیت کے اعمال ہیں۔ یہ صرفِ دولت اللہ کے نام پر اللہ کے بندوں کے لیئے ہے اور اس کے لیئے ارشاد ہے کہ ''جن لوگوں نے چاندی اور سونا جمع کر رکھا ہے اور اس میں سے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انہیں تکلیف دہ عذاب کی بشارت دیدیجئے''۔ یہاں لفظ بشارت کا استعمال نہایت بلیغ ہے جو بالعموم خوشخبری کے

معنی رکھتا ہے مگر یہاں عذاب کی خبر کو خوش خبری کہا گیا ہے کہ یہ خبر انفاق نہ کرنے والوں کے لیئے ہے۔

وجوب زکوٰۃ

زیر نظر عنوان کے تحت اس فرد کی حیثیت کی نشاندہی مقصود ہے جس پر زکوٰۃ فرض ہے۔ فرضیت زکوٰۃ کے لیئے درج ذیل سات (۷) شرائط ہیں۔

☆ مسلمان ہونا شرط زکوٰۃ ہے کہ یہ غیر مسلموں پر واجب نہیں ہے۔

☆ دوسری شرط بلوغ ہے کہ زکوٰۃ بچہ پر واجب نہیں۔

☆ عاقل پر زکوٰۃ واجب ہے مجنون یا دیوانے پر واجب نہیں

☆ غلام پر زکوٰۃ واجب نہیں وجوب زکوٰۃ کے لیئے آزاد ہونا ضروری ہے۔

☆ زکوٰۃ صاحب نصاب پر واجب ہے فقیر پر نہیں نصاب کی شرح آئندہ سطور میں پیش کی جائے گی۔

☆ نصاب کا پورے سال مالک کے زیر تصرف ہونا ضروری ہے۔

☆ نصاب کا دین سے آزاد یا فارغ ہونا ضروری ہے۔

زکوٰۃ کے شرعی معنی دولت کے چالیسواں (مقررہ) حصہ کا اللہ کے نام پر فقیر کو مالک کر دینا ہے۔ مستحق زکوٰۃ وہ فقیر ہے جو نہ ہاشمی ہو نہ ہاشمی کا آزاد کردہ غلام اور نہ ہی اتنا نا سمجھ (مجنون یا بچہ) ہو کہ وہ اپنے ملک کی حفاظت نہ کر سکے۔

نصاب کا تعین۔

نصاب میں روزمرہ گھریلو اشیاء کا شمار نہیں باقی اموال تجارت اور زراعت

وگلہ بانی نیز ہر طرح کے اندوختہ پر زکوٰۃ واجب ہے۔عرف عام میں نصاب دوسو درہم ہے سونے کا نصاب ۲۰ مثقال (تقریباً ساڑھے سات تولہ) ہے۔چاندی کا نصاب ساڑھے باون تولہ ہے۔ پانچ اونٹ کم از کم نصاب ہے زائد کی تفصیلات درجہ بدرجہ ہیں۔اسی طرح گائے اور بکریوں کا نصاب بھی تعین شدہ ہے۔

دیگر انفرادی مدّات صرف میں صدقۂ فطر۔ دیگر صدقات ۔ صلہ رحمی۔ انفاق۔غرباء ومساکین، پڑوسی اور مسافر وطلبہ پر خرچ کرنے کی تاکید ہے۔بعض ترغیبات ہیں بعض مباحات اور بعض واجبات مثلاً صدقہ فطر واجب ہے۔ان کے علاوہ بھی احسان کا حکم ہے ۔ والدین ۔زوجین۔ اولاد۔ اقرباء اور پڑوسیوں کی خدمت وحاجت روائی بھی مثبت اقدام صرف میں شمار ہے۔سائل کو دینا جہاد۔ میں دینا اور دیگر فلاحی کاموں میں بھی صرف کی ترغیب بلکہ بعض جگہ تاکید ہے۔

اجتماعی مدات خرچ

جیسے انفرادی حوالوں سے سطور بالا میں بعض انفرادی مدات خرچ کا تذکرہ ہے اسی طرح بعض مدات صرفِ دولت اجتماعی نوعیت کی بھی ہیں جن کا مرکزی ادارہ بیت المال ہے۔

بیت المال

یہ مرکزی حکومت کا سب سے بڑا مالیاتی ادارہ ہے جو چودہ سو سال پہلے کا اسٹیٹ بینک ہے۔حکومت کی تمام معاشی و مالی سرگرمیوں کا مرکز ہے جو براہ راست خلیفۂ وقت کی نگرانی میں یا اس کے مقرر کردہ کسی افسر کے تحت کام کرتا ہے۔حکومت کے جملہ اموال اور آمد وخرچ اسی کے تابع ہیں۔حکومتی آمدنی کے اہم ذرائع اسلامی معیشت کے مطابق درج ذیل ہیں۔

۱۔ جزیہ

یہ مسلم مملکت میں غیر مسلموں یا ان ذِمّیوں سے وصول کیا جانے والا ٹیکس ہے جو فوجی خدمات انجام نہ دیتے تھے یہ ان کے جان و مال کے تحفظ کا معاوضہ ہے۔ اس سے بوڑھے۔ بچے۔ عورتیں اور معذور لوگ مستثنٰی ہیں۔

۲۔ غنیمت

جہاد میں فتح کے بعد مغلوب کا مال و اسباب جو لشکر اسلام کے ہاتھ آتا ہے غنیمت کہلاتا ہے یہ بھی بیت المال کی آمدنی کا اہم ذریعہ ہے اس میں حسب خدمات مال مجاہدین میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

۳۔ عشر

مال کے دسویں حصّہ کو کہتے ہیں۔ یہ ایک قسم کا لگان ہے جو زرعی منافع سے حاصل کیا جاتا ہے۔

۴۔ عطیات

جہاد وغیرہ کے موقع پر یا اور کسی محل پر وہ ڈونیشن جو اہل ثروت حکومت وقت کو پیش کریں بیت المال کی آمدن کا ایک ذریعہ ہے۔

۵۔ صنعت وحرفت وتجارت

ان ذرائع سے حکومت کو حاصل ہونے والی آمدن بھی بیت المال کا ذریعہ آمدن ہے۔

مندرجہ بالا ذرائع سے حاصل شدہ رقوم انفرادی یا اجتماعی خیر کے لیئے خلیفہ وقت کی صواب دید پر حکومت اور عوام کی فلاح پر خرچ کی جاتی ہیں۔

آئندہ صفحات میں جن نفسیاتی مسائل پر بحث کی گئی ہے
ان کا کوئی حوالہ سائنسی نفسیات میں نہیں ملتا۔ مگر اسلامی
تعلیمات میں ان کی نشاندہی کی گئی ہے۔

فائق

پانچواں باب

تین نفسیاتی مسائل اور اسلام

ا۔ غم

۲۔ خوف

۳۔ ہوس

''غم اور خوف''

غم اردو زبان کا ایک نہایت ہی بلیغ لفظ ہے جس کے بسیط تر مفہوم کو ادا کرنے والے الفاظ دیگر زبانوں میں بھی نہیں ملتے۔ یونانی زبان کا لفظ (Melancholy) میلنیکولی میں مرضیاتی حوالے کی جھلک ہے۔ انگریزی لفظ Depression اضمحلال کے معنی رکھتا ہے۔ فارسی لفظ رنج ایک ہلکا لفظ ہے۔ ہندی دکھ بھی درد سے قریب ہے۔ عربی الم اور حزن میں حزن قریب تر ہے مگر اس وسیع مفہوم کی نمائندگی نہیں کرتا جو ''غم'' کا تعقل ہے۔

اگر ہم معروف زبانوں کے ادب کا جائزہ لیں تو یونانی صنفِ سخن ڈرامہ خاص کر ٹریجڈی غم کے مفہوم کا سب سے بڑا اظہار ہے۔ اس کے علاوہ انگریزی ادب میں ''فردوس گم گشتہ'' "Paradise Lost" بھی غم کا ایک عظیم شاہکار ہے۔ شیلے کی ویسٹ ونڈ کو بھی اس حوالے سے خارج نہیں کیا جا سکتا جب وہ کہتا ہے۔ "I fell on the thorns of life, I bleed" با این ہمہ اردو ادب میں خاص کر غزل میں جو غم ملتا ہے وہ کہیں اور نہیں ہے۔ میرؔ صاحب کہتے ہیں:

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا
دم کے جانے کا نہایت غم رہا

غالبؔ نے یہی بات زیادہ فلسفایانہ انداز میں کہی ہے۔

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

موازنہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ غالبؔ کے ہاں جو غم سے نجات کا حوالہ یا دبی دبی آرزو ہے وہ میر کے حوالۂ غم کے مقابلہ میں ادنیٰ ہے کہ میرؔ صاحب کو دم کے جانے کا غم اس لیئے ہے کہ اس کے ساتھ غم ختم ہوگیا۔ میر صاحب سے ہم آہنگ رویہ فانیؔ بدایونی کا ہے وہ کہتے ہیں۔

وہ بدگماں کہ مجھے تاب رنج زیست نہیں
مجھے یہ غم کہ غمِ جاوداں نہیں ملتا!

موازنہ کیجئے تو غالبؔ غم سے نجات کے خواہاں نظر آئینگے۔ میرؔ صاحب غم کے جانے سے رنجیدہ اور فانی غم کے آرزومند۔ فانی کو جب ایک مرتبہ جوش نے دعوت (شراب) دی اور کہا آیئے غم بھلائیں تو فانی نے کہا۔

''غم بھلانے کی نہیں یادرکھنے کی چیز ہے۔''

بات صرف میر، غالبؔ اور فانیؔ تک ہی محدود نہیں بلکہ پوری غزل غم کا بہترین مرقع ہے اصغرؔ گونڈوی کا رویہ لذّتِ غم کا آئینہ دار ہے

آلام روزگار کو آساں بنادیا
جو غم ہوا اسے غم جاناں بنادیا

غزل میں غم کے تصور میں ہر چند غم ''جاناں' کی جھلک مجاز اور حقیقت ہر دو حوالوں سے موجود ہے جو پوری زندگی پر محیط ہے۔ غم فارسی غزل میں بھی نمایاں ہے مگر اردو غزل سے کم ہے۔

سوزِ غم دیکھ مجھے اس نے یہ ارشاد کیا
جا تجھے کشمکشِ دہر سے آزاد کیا

(جوش)

غم ایک نفسیاتی مسئلہ:

غم ایک نفسیاتی مسئلہ تو ہے مگر کوئی بڑی اور اہم نفسیاتی اصطلاح نہیں ہے۔ نفسیات میں اس کے مفہوم سے قریب تر اصطلاح Frustration استعمال ہوتی ہے جس کے لیئے اردو اصطلاح شکست و محرومی ہے۔ اگر نفسیاتی لحاظ سے غور کیا جائے تو 'غم' محرومی کا ہی ایک تاثر ہے شکست و محرومی سے ہر نارمل عاقل و بالغ فرد کو عملی زندگی میں دوچار ہونا پڑتا ہے اس کی نوعیت بالعموم معروضی ہے یہ درج ذیل تین شکلوں میں سے کسی نہ کسی ایک شکل سے وابستہ ہے۔

۱۔ جو پاس سے چلا گیا اس کا غم

۲۔ جو ملنا چاہیئے تھا نہیں ملا اس کا غم

۳۔ انعام کے بدلے سزا ملی اس کا غم

یہ تینوں عنوانات حقیقی زندگی کا لازمہ ہیں۔ دنیا کا کوبھی شخص ایسا نہیں جس نے کچھ کھویا نہ ہو...... اور ایسا ابھی کوئی شخص نہیں کہ اس نے جو کچھ چاہا ہو وہ مل گیا ہو...... اور ایسے بھی اکثر لوگ ہیں کہ جنہیں توقع کے برخلاف فائدہ کی جگہ نقصان اور انعام کی جگہ سزا بھگتنی پڑی ہو۔ چنانچہ ان اسباب کا شکار ہونے والے تمام لوگ محرومی کا شکار ہوتے ہیں اور ذہن اس محرومی کے کرب سے شعور کو بچانے کے

لیئے اسے لاشعور میں منتقل کر دیتا ہے۔ اس عمل کو Repression یا تعقیب کہتے ہیں یہ عمل ارادۃً نہیں بلکہ لاشعوری طور سے وقوع پذیر ہوتا ہے۔ چنانچہ شعور تو غم کے کرب سے بچ جاتا ہے مگر یہ شکستہ جذبہ لاشعور میں فعال رہتا ہے اور اپنی شکل بدل بدل کر ظاہر ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ تمام بدلی ہوئی غم کی شکلیں نفسیاتی فسادات کی تعریف میں آتی ہیں۔ چنانچہ نفسیاتی فسادات سے بچنے کی واحد شکل ''غم کو لاشعور میں منتقل کرنے کے بجائے شعور میں رکھ کر برداشت کرنا ہے۔ ہر فرد میں اس شعوری کرب کو برداشت کرنے کی صلاحیت مختلف ہوتی ہے جسے انگریزی میں "Frustration Tolerance Level" کہتے ہیں۔ عملی زندگی کو نفسیاتی الجھنوں اور فسادات سے بچا کر صحت مندانہ طریقے سے گزارنے کے لیئے سطح غم "Frustration Tolerance Level" میں اضافہ کرنا پڑتا ہے۔ بڑھتے ہوئے اس "Frustration Tolerance Level" کو اسلامی اصطلاح میں ''صبر'' کہتے ہیں اور ارشاد باری ہے کہ ''اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے'' ویسے تو بکرے پر جب چھری پھیری جاتی ہے تو اسے وہ بھی برداشت کرنی پڑتی ہے مگر یہ برداشت ''صبر نہیں جبر'' ہے۔ جبر اور صبر میں ایک نازک سا فرق ہے اور وہ یہ کہ ''صبر میں شکر کا عنصر بھی شامل ہے'' جو جبر میں نہیں ہے۔ چنانچہ اسلامی نظام میں اس کا حل غم کے اثرات بد سے بچنے کے لیئے خود کو ''صبر و شکر کا خوگر بنانا ہے۔''

غم اور زمانہ

تصور غم کو اجاگر کرنے اور اس کے بھرپور مفہوم کو سمجھنے کے لیئے غم کو زمانی نسبت سے سمجھنا ضروری ہے اور اس حوالے سے اگر غور کیا جائے تو غم کا تعلق نہ

حال سے ہے اور نہ مستقبل سے بلکہ غم کے اسباب ہمیشہ ایک قصہ پارینہ ہوتے ہیں۔ یعنی غم کا تعلق ماضی سے ہے غم اس کا ہوتا ہے جو ہو چکا اس کا نہیں ہوتا جو ہوگا اور نہ اس کا جو ہو رہا ہے۔ ''جو محرومی حاصل ہو رہی ہے اس کی تشویش ہوتی ہے جو ہوگی اس کا خوف ہوتا ہے اور جو ہو چکی اس کا غم'' اہل نظر اس چھوٹے سے جملے کو ذرا غور سے پڑھیں کہ ''غم ماضی کا ہے۔ تشویش حال پر ہے۔ اور خوف مستقبل کا ہے'' اس حوالے سے ذرا آگے بڑھیئے تو ایک نازک تر مسئلہ سامنے آتا ہے۔

غم اور رضائے الٰہی:

ویسے تو دنیا بھر کے ادب اور قنوطی فلسفہ میں غم کی عظمت کے بڑے راگ ''الاپے'' گئے ہیں مگر شریعت مطاہرہ میں اور طریقت اسلامیہ میں غم کوئی مثبت قدر نہیں ہے اگر آپ غور کریں تو اس کائنات میں اب تک جو ہوا جو ہو رہا ہے اور جو ہوگا وہ سب اللہ کے چاہنے سے ہے اور اس کی مرضی ہے۔ پورا ماضی مشیّت کی رضا ہے چنانچہ گذشتہ پر تأسف حقیقی معنوں میں اللہ کی مرضی سے انحراف ہے کہ ہم نے جو چاہا وہ نہیں ہوا اس نے جو چاہا وہ ہو گیا یعنی یہ کہ ہماری مرضی کچھ تھی اور اللہ کی مرضی کچھ اور...... اب غور فرمائیے کیا بندے کے لیئے وہ چاہنا مناسب ہے جو خلاف مرضی رب ہو۔ اگر نہیں تو پھر ''غم کیسا؟'' یہ تو اللہ والوں کا وطیرہ نہیں ہے۔ اللہ کے دوست تو وہ ہیں جن کے پاس ''حزن'' نہیں ہوتا چنانچہ شریعت اور طریقت دونوں حوالوں سے غم اسلامی اخلاق کا پسندیدہ جذبہ نہیں ہے۔ فلسفی اور شاعر کچھ بھی کہیں ''عقل عامہ'' بھی غم کی عظمت کے نعرے لگائے مگر غم ایک منفی قدر ہے جسے اپنانے کے نعرے پسندیدہ نہیں ہیں شاعر تو یہی کہتا ہے کہ۔

شکست دل شکست غم نہیں ہے
مجھے یہ بھی سہارا کم نہیں ہے

یہ قنوطیت فرد اور معاشرے دونوں کے لیئے کوئی مثبت قدر نہیں مثبت بات تو ''اس کی رضا میں راضی ہونا ہے'' رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو دیکھئے آپ نے بے انتہا کرب و اذیت کی زندگی گزاری مگر آپ کے چہرہ انور سے کبھی غمگینی کا تاثر نہیں ملا اپنے بیٹے کی وفات پر آنسو بھی بہائے مگر غم کو پالا نہیں اور چہرۂ مبارک سے تاثر یہ ہی ملتا رہا کہ '' جیسے اب مسکرانے والے ہیں'' یہ بشاشت رضائے الٰہی میں راضی ہونے سے آتی ہے صلوٰۃ وسلام اس پر جس کے لیئے کہا گیا!

تری صورت تری سیرت ترا نقشہ ترا جلوہ
تبسم گفتگو بندہ نوازی خندہ پیشانی

اب دوسرے نفسیاتی مسئلہ یعنی خوف کی شرح سے پہلے ایک درمیانی اصطلاح ''تشویش'' سے متعلق چند باتیں عرض کرنی ہیں اللہ تعالیٰ تشویش۔ غم اور خوف سے پاک نفس یعنی ''نفس مطمئنہ'' سے ارشاد فرماتا ہے کہ ''اے نفس مطمئنہ'' تو مجھ سے راضی اور میں تجھ سے راضی آ میری عبدیت اور میری جنت میں داخل ہو جا'' یہ ہے معراج انسانیت اور معراج زندگی اور اس منزل تک پہنچنے کے لیئے غم خوف اور تشویش سے دامن بچا کر ''صبر، شکر اور توکل کے ساتھ اس کی رحمت پر نظر رکھ کر اپنے دامن کو مایوسی سے پاک کرنا ضروری ہے۔

تشویش کیا ہے؟ حال پر پریشان ہونا۔ جیسا کہ سطور بالا میں کہا گیا ہے غم ماضی ہے خوف مستقبل اور تشویش حال ہے۔ حال کیا ہے؟ ماضی اور مستقبل کے

درمیان ایک ''نقطۂ اتصال'' اور یہ نقطہ بھی لحاتی ورنہ اَب سے پہلے کا لمحہ ماضی ہے اور اگلا لمحہ مستقبل۔ حال تو ان دونوں لمحات کے درمیان ایک تجریدی وقفہ ہے۔ اگر دشمن حملہ آوار ہوا اور اس نے بم باری کر کے تباہی مچادی تو جو بم باری ہوئی اس کا غم ہے۔ جو ہو رہی ہے اس پر تشویش ہے اور جو ہوگئی اس کا خوف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تشویش یا تو غم بن جاتی ہے یا خوف سوائے ان دبے ہوئے جذبات کے جو ''بے نام'' تشویش کی شکل اختیار کر لیں جس میں تشویش ہوتی ہے مگر تشویش کا عنوان غائب ہوتا ہے اسے "Free Floating Anxiety" کہتے ہیں۔

خوف:

خوف کے حوالے سے میری تحریر عام ڈگر سے ذرا ہٹی ہوئی ہوگی۔ عام طور سے لوگ زیاں اور خسارے کا خوف سمجھتے ہیں اور خوف کے عنوان میں دشمن یا ضرر رساں عامل کا حوالہ ہوتا ہے۔ موت کا خوف۔ آفات کا خوف۔ مصائب کا خوف۔ چور ڈاکوؤں اور لٹیروں کا خوف سانپ کا اور زہریلے جانوروں کا خوف۔ درندوں کا خوف دشمن کا خوف یہ سب خوف کے معروف عنوانات ہیں مگر راقم ان سے ہٹ کر بھی ایک خوف کا حوالہ دینا چاہتا ہے وہ دشمن کے برخلاف دوست کا خوف ہے۔ دشمن سے تو خوف یہ ہے کہ وہ ہمیں ضرر پہنچائیگا مگر ''دوست سے خوف یہ ہے کہ کہیں وہ ہم سے ناراض نہ ہو جائے!'' یہ تصور عام نہیں ہے مجھے ایسے خوف کی صرف ایک شعری مثال یاد ہے کہ

میں نے فانی ڈوبتے دیکھی ہے نبض کائنات
جب مزاج یار کچھ برہم نظر آیا مجھے

تو مزاج یار کے برہم ہونے کا خوف غیر مرضیاتی اور مثبت قدر ہے بچہ ماں باپ سے شاگرد استاد سے اور بندہ اللہ سے اس لیئے ڈرتا ہے کہ وہ ناراض نہ ہو جائے۔ یہ مثبت خوف جسے فارسی میں ''خوف خدا'' کہتے ہیں خاصہ مومن اور شرط ایمان ہے جس کے لیئے زیادہ موزوں اصطلاح خشیّت الٰہی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ دشمن کے پہنچائے ہوئے ضرر سے زیادہ کرب انگیز ''دوست کی رضا سے محرومی کا کرب ہے۔'' اللہ کی ناراضگی سے چونکہ قبر و حشر و آخرت کے عذاب کا خوف وابستہ ہے اس لیئے اس خوف کو ضرر کا خوف کہا جا سکتا مگر'' طالب مولا کی خشیت عذاب کے خوف سے بالاتر ہے۔ اسی لیئے طالب مولا ''محمود'' طالب عقبیٰ ''مسعود'' اور طالب دنیا ''مردود'' ہے۔ اور جو ''محمود'' ہے اسے خوف دنیا و عقبیٰ کے مفادات کے لیئے نہیں بلکہ رضائے الٰہی کے لیئے ہے اس نوع کے خوف کے علاوہ خوف کی جتنی اقسام ہیں ان میں سے کچھ نارمل شمار ہوتی ہیں اور کچھ Abnormal غیر معمولی یا ابنارمل خوف کے لیئے ''فوبیا'' کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ فارسی میں خوف کے لیئے ''ترس'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے جیسے خوف خدا کو ''خدا ترسی'' بھی کہتے ہیں مگر ترسی کا ایک پہلو فوبیا سے زیادہ قریب ہے جیسے Hydrophobia کو ''آب ترسی'' اور Photophobia کو تاب ترسی کہتے ہیں دیگر اشکال میں اہم حسب ذیل ہیں۔

☆ بلندی سے خوف — Acrophobia

☆ میدان یا بازار سے خوف — Agrophobia

☆ انسانوں سے خوف — Anthrophobia

☆ بند جگہوں سے خوف — Claustrophobia

☆ بیماری سے خوف Pathophobia

☆ پانی سے خوف Hydrophobia

☆ روشنی سے خوف Photophobia

☆ حیوانوں سے خوف Zoophobia

مندرجہ بالا کے علاوہ اور بھی بہت سے خوف ہیں ہومیو پیتھک ریپرٹری کے حوالے سے ان میں درج ذیل زیادہ معروف ہیں

☆ تنہائی کا خوف

☆ رات یا اندھیرے کا خوف

☆ سانپ یا دوسرے جانوروں (چھپکلی۔تک) کا خوف

☆ ہیضہ کا خوف

☆ کینسر کا خوف

☆ اجتماع میں شرکت کا خوف

☆ مجمع کا خوف

☆ کتوں کا خوف

☆ انجانا خوف (کچھ ہو جانے کا)

☆ زخمی ہو جانے کا خوف

☆ پاگل ہو جانے کا خوف

☆ بدبختی کا خوف

☆ حادثہ کا خوف

☆ سیلاب کا خوف

☆ خسارے کا خوف

☆ غربت کا خوف

☆ ڈاکوؤں کا خوف

☆ طوفانِ بادوباراں کا خوف

☆ زہر دہی کا خوف

☆ دوا کی بوتل کا خوف

اور سب سے بڑھ کر موت کا خوف جسے ہر خوف کی ماں کا درجہ حاصل ہے۔ کیا تضاد ہے کہ ہر انسان کو یقین مرگ بھی ہے اور خوف مرگ بھی مگر اہل ایمان کی بات اور ہے

قربان عشق موت بھی آئی تو کیا ہوا

اس تیرِ بے خطا کا نشانہ خطا ہوا

ایسے ہی خوف نے ابتدائی دور میں انسان کو آگ ۔ سانپ بندر ۔ ریچھ اور دوسرے جانوروں کی پرستش پر مائل کر کے بت ترشوا دیئے۔ اس بات سے انکار نہیں کہ ہر ضرر انگیز عنصر سے بچنا اور احتیاط کرنا ضروری ہے مگر گریز اور خوف میں فرق ہے اور پھر خوف بھی عام افراد والا نہیں بلکہ مرضیاتی خوف تو انتہا ہی بد بختی ہے۔

خوف اور اسلام

اس جہانِ آب وگل میں مخلوق سے ڈرنا کوئی مثبت قدر نہیں ہے بلکہ یہ اسلام کا ناپسندیدہ عمل ہے۔ لا الٰہ کے بعد الا اللہ کہہ کر پھر اللہ کے سوا کسی غیر سے ڈرنا ایک تضاد ہے۔ اس عالم ارضی سے ہٹ کر جو مخلوق ہے۔ جہنم۔ آگ اور عذاب سے ڈرنا دراصل مخلوق سے ڈرنا نہیں بلکہ خالق سے ہی ڈرنا ہے۔

جنت میں رکھ مجھے کہ جہنم میں ڈال دے
لیکن نگاہِ لطف و کرم میں کمی نہ ہو

یہاں رابعہ بصری سے منسوب وہ حکایت یاد آتی ہے کہ ایک ہاتھ میں پانی کا لوٹا اور دوسرے میں مشعل لے کر چلیں۔ کسی نے پوچھا یہ کیا ہے تو فرمایا کہ مشعل سے جنت میں آگ لگاؤنگی اور پانی سے جہنم کو بجھاؤں گی کہ یہ اللہ کی محبت میں حائل نہ ہوں۔ یہ بے خوفی دراصل ان ہی لوگوں کا حصہ ہے جن کے لیئے ارشاد ہوا

اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَاخَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَاھُمْ یَحْزَنُوْنُ

''بے شک اللہ کے دوستوں کو نہ خوف ہے اور نہ غم ہے''

خوف اور غم حُبِ الٰہی کی راہ میں رکاوٹیں ہیں

(فائق)

ضمیمہ

غم اور خوف پر تحریر مکمل کرنے کے بعد پھر ایک خیال نے ذہن پر دستک دی۔ خیال یہ تھا کہ خوف اور غم کے علاوہ ایک اور بشری خاصہ بھی ایسا ہے جس کے ظہور سے انفرادی اور اجتماعی سطح پر ہزار ہا قسم کی خرابیاں اور لاکھوں انفرادی اور اجتماعی مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ شائستہ اور مہذب زبان میں اسے ''آرزومندی'' کہہ سکتے ہیں مگر یہ لفظ شریفانہ اور مہذب ہے اس کا غیر مہذب مترادف بلکہ مترادف سے بھی کچھ آگے ہم مزاج لفظ ''ہوس'' ہے گھر بار بیوی بچوں عزت شہرت اور زر دولت کی آرزو تو کوئی گناہ نہیں مگر اس جذبہ کا اعتدال کی حد سے آگے بڑھ کر ہوس کی شکل اختیار کر لینا اکثر اخلاقی نظاموں اور خاص کر اسلام کے اخلاقی نظام میں ناپسندیدہ بلکہ میرے نزدیک منہیات میں شامل ہے مجھے اس لفظ کی دو جھلکیاں دنیا کے ادب میں قدرے مثبت انداز میں نظر آئیں ایک تو غالبؔ نے اس سے نشاط کار کو وابستہ کیا دوسرے سگمنڈ فرائڈ نے یہ لفظ "ID" کی اصطلاح میں انسان کی بنیادی جبلت کے طور پر بیان کیا اور تحلیل نفسی کے مکتبہ فکر کی بنیاد اس پر رکھی مگر یہ دونوں شخصیتیں اپنے کردار و اخلاق کے حوالے سے کوئی اچھی مثال نہیں ہیں ان کے علاوہ اپنے محدود مطالعہ کے مطابق مجھے ''ہوس کے مثبت پہلو کسی تحریر میں نظر نہیں آئے۔

اپنی ضرورتوں کی تکمیل کے لیئے تسکینی ذرائع کی آرزو و تمنا بلکہ سعی بھی کوئی بری بات نہیں ہے تمام ضابطے اس جدوجہد کو مثبت قرار دیتے ہیں مگر تکمیل ضروریات سے آگے ''ہوس زرداری'' یا عزت و شہرت کی ہوس یا دوسری لذتوں

کی ہوس ہر اخلاقی نظام میں ناپسندیدہ ہے۔ ''جولیس سیزر'' جیسی عظیم شخصیت کو اسی جذبہ کی پاداش میں زندگی سے ہاتھ دھونے پڑے۔ موسوی دور میں قارون کا واقعہ قصص القران میں ہے کہ ہوس زر نے اسے کس طرح دفن کر دیا مگر افسوس کہ آج کے مہذب آفاقی معاشرہ میں بھی ترقی پذیر اور ترقی یافتہ ممالک کی تفریق سے قطع نظر یہ مرض عام ہے۔ کم پڑھے لکھے اور جاہل عوام کی تو بات چھوڑیئے ہر معاشرے کی بڑی شخصیات ہوس کا شکار نظر آتی ہیں۔ ہوس اقتدار کا تجزیہ کیجئے تو اس کے پیچھے بھی دولت و عزت کی ہوس ہی کارفرما نظر آتی ہے اور یہ جذبہ اتنا اندھا ہے کہ عبرت انگیز مثالیں سامنے آنے کے باوجود فرد اس سے جان نہیں چھڑا سکتا۔ نفسیات کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے میں یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ہوس دراصل ایک نفسیاتی مرض ہے جس کے مریض عام فرد کی حیثیت سے نہیں بلکہ کہیں کہیں تو قائدین اور سربراہوں کی حیثیت سے بھی سینہ تانے پھرتے ہیں بعض ماہرین نے پوری تاریخ کی مادی تعبیر کر کے اس سے معاشی نتائج اخذ کیئے ہیں مگر انہوں نے بھی ''مادیت کے حصول'' کے پیچھے کارفرما اس نفسیاتی رویہ کا کوئی حوالہ نہیں دیا جسے ''ہوس'' کہتے ہیں۔

ذرا تاریخ پر نظر ڈالیئے تو معلوم تاریخ میں انبیاءؑ اور اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ کوئی سماجی گروہ اس عیب سے پاک نظر نہیں آتا ہاں صوفیاء و فقرا کا ایک طبقہ تو ایسا ہے جو اس ''مسموم جذبہ سے خوف و غم کی طرح پاک ہے'' مگر اس سے نچلی سطح پر تین قسم کی ہوس عام ہے۔

☆ ہوس زر

☆ ہوس عزت و شہرت

☆ ہوسِ لذّت

ویسے تو ''ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے'' مگر ان میں سب سے مظبوط عام اور مستحکم ''ہوس زر'' ہے جس کے نتیجہ میں ہزار معاشرتی برائیاں پیدا ہوتی ہیں ان میں خاص الخاص درج ذیل:

☆ چوری

☆ ڈاکہ

☆ رشوت

☆ جوا۔سٹہ

☆ اسمگلنگ

اب ان مصائب کے ذیلی مضمرات پر نظر کیجیئے تو تمام تو نہیں چند اہم اور عام جرم جھوٹ ۔ دھوکہ ۔تشدد۔قتل ۔فرار وغیرہ ہوس زر سے ہی وابستہ ہیں۔ جب آدمی علی الاعلان دولت حاصل نہیں کرتا تو اجتماعی سطح پر اسمگلنگ کرتا ہے رشوت لیتا ہے انفرادی حیثیت میں جواسٹہ چوری اور ڈاکے کا مرتکب ہوتا ہے۔ پھر اس کی سزا سے بچنے کے لیئے جھوٹ بولتا ہے۔دھوکہ دیتا ہے۔تشدد اور قتل کرتا ہے اور جب فرد ان تمام جرائم کے ارتکاب سے (اکثر عزت بیچ کر) پیسہ کما لیتا ہے تو پھر پیسہ سے عزت وشہرت حاصل کرنا چاہتا ہے۔''حصول عزت وشہرت'' کا فریب بھی عجیب ہے جب دھو کے دھونس ۔ دھاندلی اور مکاری سے نام نہاد عزت وشہرت حاصل ہو جاتی ہے پھر اقتدار کی طرف لپکتا ہے سیاست میں آتا ہے

اور اس کے پردہ میں مزید نئے نئے جرائم کا مرتکب ہوتا ہے۔ دنیا کچھ کہے پر اسے کسی کی پروانہیں رہتی وہ اپنی نظر میں معزز و محترم ہو جانے کے بعد ہر تبصرے سے بالاتر ہو جاتا ہے اسے کسی کی پروانہیں رہتی۔

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

اور بات غائبانہ تک نہیں رہتی لوگ منہ پر گالیاں دیتے ہیں گندے انڈے پھینکتے ہیں جوتے دکھاتے ہیں مگر شیطان کے وسیلہ سے حاصل شدہ عزت وشہرت کے بعد'' اس کے قلب پر سماعت پر اور بصارت پر مہر لگ جاتی ہے اور ناقابل اصلاح ہو جاتا ہے تا آنکہ اس جیسا ہی کوئی اس کا رقیب اسے انجام کو پہنچا دیتا ہے۔ مگر اس جیسے دوسرے اس سے عبرت حاصل نہیں کرتے ان کی آرزو یہی رہتی ہے۔

بینک بیلنس بھی ہو کیش بھی ہو کار بھی ہو
بوٹس بھی چلنے لگیں پانی کا بیوپار بھی ہو
بے نیازی رہے گھر سے۔ رہیں ہوٹل آباد
یعنی وہ اُس طرف آزاد اِدھر ہم آزاد
دن جو بازار میں تو رات کلب میں گزرے
زندگی اپنے کمیشن کی طلب میں گزرے

شہر میں آوں نظر اور کبھی گاؤں میں
دوں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں
ایک حلقہ ہو مرا جس میں مرے یار بھی ہوں
ان میں کاہل بھی ہوں غافل بھی ہوں ہوشیار بھی ہوں

اوپر بیان کردہ ہر ہوس سے بُری ''ہوس لذت پرستی ہے'' یہ بشری جبر ہے بچہ ماں کی گود اور شیر خواری سے جو حصول لذّت کا عادی ہوتا ہے تو عالم نزع تک اس کی یہ لذت پرستی ختم نہیں ہوتی اولیاء۔ صوفیاء اور فقراء میں تو ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ انہوں ''ترک لذّات'' اور تجرد کے ذریعہ اس طوفان کا رخ موڑ دیا ہے مگر یہ عام آدمی کے بس کی بات نہیں۔ عام آدمی کی سطح پر معتدل اور متوازی لذت پسندی تو کوئی ضابطہ اخلاق منع نہیں کرتا مگر لذت کی دیوانگی یا اس کی پرستش ناپسندیدہ ہے اگر سرسری نظر سے بھی لذت پسندی کے عنوان کا جائزہ لیں تو ان میں سے چند اہم عنوانات حسب ذیل ہیں۔

☆ خورد و نوش کی لذّت

☆ پوشاک کی لذّت

☆ جنس کی لذّت

خورد و نوش کی لذّت پسندی فطرت انسانی کا خاصہ معلوم ہوتی ہے۔ بنیادی طور سے تو لذّتِ کام و دہن۔ میٹھے، نمکین۔ کھٹے۔ ٹھنڈے اور گرم میں محدود ہے مگر انسان نے تہذیبی ارتقا کے مختلف مدارج میں لذیذ کھانوں اور مشروبات کے ڈھیر لگا دیئے ہیں۔ کھانوں کی انواع و اقسام کو تو چھوڑ یئے مختلف قسم کے عروق۔

شربت اور بوتلیں اس قدر متنوع ذائقہ کی دستیاب ہیں کہ ان کا شمار مشکل ہے پھر ہمارے ہاں مغلیہ دور سے برطانوی دور تک جو کھانوں کی اقسام دستیاب ہیں ان کا بھی کو شمار نہیں ذائقہ کی لذّت کے علاوہ انہیں عوامل سے جو منشّیات تیار کی گئی ہیں وہ بھی ذائقہ میں نہیں تو خورد و نوش میں تو ضرور شمار ہوتی ہیں شراب کی کتنی قسمیں اور دوسرے خوردنی وکشیدنی کتنے نشہ ہیں اس کا بھی شمار مشکل ہے خورد و نوش کے حوالے سے سکر انگیز یا نشہ آور اشیاء کے استعمال کو کوئی معاشرہ قابل تعریف قرار نہیں دیتا مگر پوری دنیا میں ''خمریات'' کا دور دورہ ہے حالانکہ نشہ باز خود کہتے ہیں کہ

یہ غلط ہے کہ سکوں ملتا ہے پیمانے سے
ہم تو غم اور بڑھا لائے ہیں میخانے سے

اگر اسلامی اخلاقیات کا جائزہ لیں تو اسلام ہر چھوٹے بڑے نشہ کے خلاف ہے اس لیئے کہ منشیات کے زیر اثر فرد تہذیبی اثرات سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے ''بدمستی'' کا شکار ہو کر اعلیٰ اخلاقی اقدار کا دامن بھی چھوڑ دیتا ہے۔ یہ سب ''خرافات'' لذّتِ کام و دہن کے ہی تحت قابل شما ہیں۔

مہذب زندگی کی دوسری لذّت رہن سہن کی لذت ہے بڑے بڑے مکانات، حویلیاں۔ کوٹھیاں۔ بنگلے لگژری فلیٹس۔ بجلی۔ گیس۔ فون۔ اے سی۔ ہیٹرز پنکھے ''ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا''۔ اگر دنیا اس حوالے سے اعتدال پسند ہو جائے تو غربت وافلاس سے بڑی حد تک جان چھڑائی جاسکتی ہے ہماری زندگیوں کا تضاد ملاحظہ ہو کہ ہم قوم کے گدوں اور قالینوں پر بیٹھ کر سلام اسؐ پر بھیجتے ہیں ''ٹوٹا بوریا جس کا بچھونا تھا''

سب سے بڑی اور عبرت ناک لذّت پرستی ''جنسی لذّت'' ہے اس جذبہ نے حد سے تجاوز کر کے اور غلط راہیں اختیار کر کے معاشرہ کو جتنا نقصان پہنچایا ہے وہ اندازے سے باہر ہے اس قماش کی ''عورتوں نے بازار سجائے ہیں'' مردوں نے گھر برباد کیئے ہیں ''مشت زنی کے عادی نوجوانوں نے جوانی برباد کی ہے'' ''اغلام بازوں نے فطرت کو شرمندہ کیا ہے'' مگر جنسی لذت پرستی کا شعار عام ہو رہا ہے اسلام نے اغلام وزنا کو حرام قرار دے کر چار نکاحوں تک کی اجازت دے کر عذاب آخر سے ڈرا کر جنسی بے راہ روی سے روکنے کی بھرپور کوشش کی مگر شجر ممنوعہ کی کشش کو کیا کہیئے کہ ابن آدم آج بھی جنت سے نکلنے پر مائل ہے۔

اگر خوف۔ غم اور ہوس سے انسان دامن بچا کر ان جذبوں پر غالب آسکے تو دنیا میں ہی جنت مل سکتی ہے۔

اس سحر کے شام کے اور فیض ساقی کے نثار
اس چمن کی آرزو ہے ان بہاروں کا خمار

یاد رکھیئے

شریعت تہذیبِ نفس کا ضابطہ ہے

اور

طریقت روحانی ترقی کا راستہ ہے

(فائق)

چھٹا باب

واللہ اعلم بالصّواب

ذیل میں چند عنوانات قائم کر کے ان سے متعلق اپنے تصورات اختصار کے ساتھ تحریر کر رہا ہوں۔ یہ وہ عنوانات ہیں جو میری دینی فکر کی راہ میں کبھی میرے لیئے مسئلہ رہے ہیں مگر توفیق الٰہی سے اب ان معاملات میں میرا ذہن بالکل صاف اور قلب بحمدللہ مطمئن ہے۔ اسی لیئے انتہائی اختصار اور بھر پور اعتماد سے پیش کر رہا ہوں۔

(محمد فائق)

نوٹ

آئندہ صفحات مصنف کی کتاب اجالے سے منقول ہیں جو اب سے گیارہ سال قبل شائع ہوئی تھی۔

جبر وقدر

بہتر طریقہ یہ ہے کہ انسان لسان وقلب کی تصدیق کے ساتھ شریعت محمدی ﷺ پر عمل پیرا رہے۔ نازک اور پیچیدہ مسائل میں خود کو مبتلا کر کے اپنے یقین کو آزمائش میں نہ ڈالے اس لیئے کہ طمانیتِ قلب ایمان سے ہی حاصل ہوتی ہے بعض لوگ غور وفکر کے بعد اس منزل پر پہنچتے ہیں اور بعض کو اللہ تعالیٰ ذہنی مشقت کے بغیر ہی یہ دولت عطا کر دیتا ہے۔ جنہیں یہ دولت میسر ہے انہیں تقدیر و تدبیر کی بحث سے دور رہنا چاہیئے کہ یہ مسئلہ صدیوں سے زیر بحث رہنے کے باوجود حل نہیں ہو سکا ہے۔ اصل یہی ہے کہ ایمان جبر وقدر کے درمیان ہے۔

عالم ظاہر میں جتنا بھی انسان کا اختیار نظر آتا ہے وہ عالم باطن میں جبر ہے ہم اپنی دانست میں اپنے ارادہ سے ایک فیصلہ کرتے ہیں مگر عالم باطن میں ویسا ارادہ اور وہ فیصلہ کرنا ہمارا مقدر تھا۔ اولیاء سے جو کرامات ہوئیں اور انبیاء سے جو معجزے ہوئے وہ پہلے سے ان کا مقدر تھے۔ بلکہ خود نبوت اور ولایت بھی مقدر ہوتی ہے ہم اگر یہ سوچ کر بے عمل ہو کر بیٹھ جائیں کہ جو مقدر ہے وہ ہو کر رہے گا تو اگر ہمارے مقدر میں بے عمل ہو کر بیٹھنا ہے تو بیٹھیں گے ورنہ کسی بھی دلیل یا تاویل سے فعال ہو جائینگے۔ یا جتنی بے عملی مقدر تھی اتنے بے عمل رہینگے اور جو عمل مقدر تھا وہ کر کے رہیں گے۔ میں ذاتی طور سے یہ رائے رکھتا ہوں کہ بندہ لوحِ محفوظ پر لکھے ہوئے کا پابند نہیں ہے بلکہ لوحِ محفوظ پر اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کی بنیاد پر وہ پہلے سے لکھ دیا ہے جو کچھ بندہ اپنے اختیار سے کرے گا۔ یہی وجہ ہے کہ گناہ کی سزا اور نیکی کی جزاء ہے۔

شرک

اللہ کو واحد اور قادر مطلق ماننے والا کبھی مشرک نہیں ہو سکتا۔ عبد کو معبود اور مخلوق کو خالق ماننے والے پر شرک عائد ہوتا ہے۔ مدح کے غلو یعنی کسی کی بڑھی

چڑھی تعریف کو شرک نہیں کہہ سکتے۔ اگر کوئی شخص اپنے شیخ کو مشکل کشاء دستگیر، مدد کرنے والا، اور شریک حال ماننے کے ساتھ انہیں اللہ کا بندہ جانتا اور مانتا ہے تو یہ عمل شرک نہیں ہے بغیر نیت کوئی شرک عائد نہیں ہوتا بعض لوگوں کا طریقہ یہ ہے کہ اگر سجدہ میں ناک زمین سے نہ لگی تو کہتے ہیں کہ سجدہ نہیں ہوا مگر اپنے شیخ کے مزار پر اگر کوئی تعظیماً سر جھکا دے تو کہتے ہیں کہ سجدہ ہوگیا ایسے دوہرے معیار والے لوگوں کے اجتہاد معتبر نہیں۔

تبلیغ و تفکر

تبلیغ دعوتِ خیر کو کہتے ہیں، منطقی مباحثہ کو نہیں۔ دعوت خیر ہر شخص کے لیئے حسب استطاعت لازم ہے۔ منطقی مباحث کسی پر فرض نہیں ہیں غور و فکر عقیدہ کو پختہ کرنے کے لیئے ہے عقیدہ کو پرکھنے کے لیئے نہیں۔ اسلامی عقیدہ حقیقت ہے اور حقیقت ہماری محتاج نہیں ہم حقیقت کے محتاج ہیں۔ غور و فکر حقیقت کو پانے کے لیئے ہے پرکھنے کے لیئے نہیں۔ ہدایت تقویٰ کرنے والوں کے لیئے ہے جو غیب پر ایمان لائے نہ کہ فلسفیوں کے لیئے۔ آغاز قرآن میں ہی الف۔ لام، میم کو کلام الٰہی ماننا بغیر سمجھے ہوئے ایمان لانے کا لازمہ ہے۔ بلکہ اس میں تو تاویل بھی احسن عمل نہیں ہے واللہ اعلم بالصواب۔ دلیل کے ذریعے اللہ کو ایک ماننا دلیل پر ایمان لانا ہے اور اللہ کو ایک مان کر قلب کو دلیل سے مطمئن کرنا اسلامی تفکّر ہے۔ دلیل و فکر کے ذریعہ توحید تسلیم کرنا کچھ اور ہے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر ایمان لا کر ان کے فرمان کے مطابق توحید کا عقیدہ رکھنا کچھ اور ہے یہ بڑی سعادت ہے۔

صاحب امر

واضح حکم ہے کہ اللہ کی اطاعت کرو اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی

اطاعت کرو اور اس کی اطاعت کرو جو تم میں صاحب امر کیا جائے۔ امر کے معنی حکم کے ہیں اور صاحب امر سے مراد وہ شخص ہے جسے حکم چلانے کا اختیار ہو۔ خلافتِ راشدہ تک تو صاحب امر واضح تھا اور سب پر امیر المومنین کی اطاعت فرض تھی اور اس کے اقرار کے لیئے بیعت کی جاتی تھی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آج کے دور میں امر کو کیسے تلاش کیا جائے اور کس کے ہاتھ پر بیعت کی جائے۔ بعض لوگ حاکم وقت کو صاحب امر تصوّر کرتے ہیں مگر حاکم وقت تو آج کی دنیا میں امر نہیں ہوتا کہ اس کی باقاعدہ اور قانونی اپوزیشن ہوتی ہے۔ اور ہر قوم و ملک میں وہ اس قوم یا ملک کے دستور کے تابع ہوتا ہے جس کی رو سے اسے حاکمیت ملی ہے۔ چنانچہ امر کے معنی ایسے فرد کے ہیں جسے باطنی طور پر وہ نعمت حاصل ہو جس کی بنیاد پر وہ حکم نافذ کر سکے جیسے عہد خلافت راشدہ میں خلفائے راشدین کو یہ نعمت حاصل رہی ہے۔ چنانچہ فی زمانہ امر کی تلاش اور اس کے ہاتھ پر بیعت وہیں کرنی چاہیئے جہاں قلب گواہی دے اور یہ بھی لازم نہیں کہ ہم میں صاحب امر ایک ہی ہو۔

نیت اور عمل

ظاہر ہے کہ فرد عمل سے پہچانا جاتا ہے کسی معاشرے میں فرد جس عمل کا مظاہرہ کرتا ہے اسی کی نسبت سے ہی اس کی شخصیت کا تعین ہوتا ہے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث شریف ہے کہ عمل نیت سے ہے اور اس حقیقت کو ماہرین نفسیات بھی تسلیم کرتے ہیں کہ نیّت کے ظہور یا خارجی اظہار کو عمل کہا جاتا ہے۔ نیز یہ کہ نیّت داخلی عمل ہے اور عمل خارجی نیّت ہے۔ نیّت صاحب معاملہ جانتا ہے اور عمل دوسروں کے لیئے قابلِ مشاہدہ ہوتا ہے۔ سزا عمل پر ہے اور جزا نیت پر بھی ہے۔ حدیث شریف ہے کہ مومن کی نیت عمل سے بہتر ہوتی ہے اور منافق کا عمل اس کی نیت سے بہتر ہوتا ہے۔ چناچہ فلاح کا راز نیّت کی صحت ہے۔

اگر ہم سے عملاً کوئی لغزش بھی ہو جائے تو اس سے تائب ہو کر نیت کی حفاظت کرنی چاہیئے۔ دراصل ایمان اور عقیدہ بھی نیت کا ہی نام ہے جب اس میں پختگی ہو گی تو یہ لازماً عمل میں ڈھلے گی۔ اسی لیئے ارشاد ہے کہ ''وقت گواہ ہے کہ انسان خسارہ میں ہے، سوائے ان کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کیئے اور سچ اور صبر کی وصیت کی۔ یعنی اعمال صالح حق کی وصیّت اور وصیّتِ صبر کے لیئے پیشگی شرط ایمان لانا ہے۔ نیت کی صحت کے بغیر کوئی نیکی نیکی نہیں ہے چنانچہ بڑی بات نیک نیّت ہونا ہے۔

نعمت اور بیان

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ آپ کے رب نے آپ کو جو نعمت دی ہے اسے بیان فرمایئے اور اولیاء کرام اپنی نعمتوں کو بیان کرنے کے بجائے چھپاتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ منصب رسالت کے لیئے اظہار لازم ہے، ولایت کے لیئے اخفا بہتر ہے۔ رسول اس منصب پر فائز ہوتا ہے جہاں اسے دوسروں کی اصلاح کے لیئے اپنی نعمتیں بیان کرنی پڑتی ہیں۔ مگر ولی اللہ پر نعمتوں کا اظہار لازم نہیں ہوتا سوائے ان کے جنہیں عالم ظاہر میں بھی نفوس کی تربیت کا کام انجام دینا ہو جیسے احیائے دین کے لیئے حضرت غوث پاک رحمۃ اللہ علیہ سے کہا گیا اور آپ نے قصیدۂ روحی اور قصیدۂ غوثیہ میں اپنی شان بیان فرمائی مگر رہروانِ راہ سلوک کے لیئے یہ بہتر ہے کہ مشیّت کے راز اخفا میں ہی رہنے دیں تا آنکہ اس کے لیئے کوئی حکم ہو جائے۔

خوف اور غم

اللہ کے دوست خوف اور غم سے بالا تر ہوتے ہیں۔ یہ خصوصیت انسان کو نفسیاتی امراض سے پاک کر دیتی ہے۔ یہ اس لیئے کہ تمام امراض کی جڑ خوف

ہے اگراس کا رخ اندر کی طرف ہو جائے تو یہ غم بن جاتا ہے اور خارج کی طرف ہو جائے تو جارحیت اور غصہ بن جاتا ہے ان ہی اعمال کی مختلف نسبتوں اور حالتوں سے نفسیاتی پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ خائف ہو کر فرد تحفظ چاہتا ہے اعتدال سے بڑھا ہوا خوف اعتدال سے بڑھے ہوئے حصول تحفظ کی ترغیب دیتا ہے اور اعتدال سے بڑھے ہوئے تحفظ کی سعی فرد کی نیت اور عمل دونوں میں فساد پیدا کر کے نفسیاتی صحت تباہ کر دیتی ہے۔ یہاں خشیّت اور خوف میں تمیز کرنی چاہیئے کہ خشیّت صرف اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہے جبکہ خوف مخلوق سے وابستہ ہے۔ ہر خوف کی جڑ موت کا خوف ہے اور وہ لوگ جو موت کو وصال جانتے ہیں خوف سے بالاتر ہو جاتے ہیں۔

جن و انس

لفظ ''جن'' کے معنی چھپے ہوئے کے ہیں یہ ایک آتشیں مخلوق ہے جو انسان کی چشم ظاہر سے پوشیدہ ہے۔ یہ مخلوق بھی معاشرتی زندگی گزارتی ہے ان میں موت اور ولادت، رشتے اور قرابت سب انسانی معاشرے کی طرح ہیں۔ ان کے باقاعدہ نام ولدیت اور شجرے موجود ہیں۔ ان میں ایماندار اور بے ایمان، نیک اور بد دونوں طرح کے ہوتے ہیں۔ یہ اپنے قول کا پاس کرنے والی مخلوق ہے۔ بعض شکلوں میں یہ متشکّل بھی ہو سکتے ہیں۔ انسانی ہیت میں آنے سے انہیں تکلیف ہوتی ہے مگر اس کا اختیار ہے۔ یہ انسانوں یعنی علماء اور اولیاء سے دینی علم کسب کرتے ہیں۔ تعلیم قرآن کے لیئے زانوئے تلمذ انسان کے آگے طے کرتے ہیں طاقت اور رفتار میں انسان سے بہت زیادہ ہیں۔ ناری ہونے کی وجہ سے نور سے ان کی ہلاکت ہے اسی لیئے اولیائے کرام کے فرمانبردار رہتے ہیں۔ انسان عاملوں کی طرح خود بھی عملیات کا ورد رکھتے ہیں۔ آیۃ الکرسی اور والناس کے علاوہ

بعض دیگر قرآنی آیات کے آگے بے بس ہو جاتے ہیں۔ سوائے اس کے کہ وہ خود بھی اس کے عامل ہوں۔ عام انسانوں سے بھی مربوط ہو سکتے ہیں اور انہیں نفع و ضرر بھی پہنچا سکتے ہیں۔ ایک روایت کے مطابق زعفر جن اپنے لشکر سمیت حضرت امام حسین علیہ السلام کی مدد کے لیئے بھی آیا تھا مگر آپ نے منظور نہیں فرمایا۔

حادثہ اور اتفاق

باطن میں اور روحانیت میں حادثہ اور اتفاق نہیں ہوتا اس لیئے کہ اپنی خلق میں واقعہ حادثہ اور اتفاق ایک ہی ہیں۔ کسی واقعہ کو ہم حادثہ یا اتفاق اپنی توقع اور اسباب کی نسبت سے کہتے ہیں۔ عالم اسباب میں علت و معلول کا جو سلسلہ ہماری توقع کے مطابق چل رہا ہے اگر کبھی خلاف توقع ہو جائے تو ہم اسے حادثہ کہتے ہیں کسی صحت مند آدمی کا اچانک انتقال کر جانا، کسی گاڑی کا اچانک اپنے راستہ سے بھٹک جانا، کسی سلسلۂ اعمال کا بدیہی اسباب سے تجاوز ہو جانا تمام شکلیں ہماری محدود بصیرت سے وابستہ ہیں۔ مگر روحانیت اور باطن کی نظر یا بصیرت محدود نہیں ہوتی اس لیئے باطن میں کوئی حادثہ نہیں ہوتا۔ نہ ہی کوئی چیز اتفاقی ہوتی ہے۔ چنانچہ باطنی اور روحانی نسبتوں سے جو بھی وقوعات ہوں انہیں مشیّت مقدّر اور مرضیٔ مولا سے تعبیر کرنا چاہیئے دین میں نہ تو فتح مکہ اتفاق ہے نہ واقعۂ کربلا۔ یہ سب پہلے سے مقدّر تھے۔

دین و دنیا

عام طور سے دین و دنیا کو دو متضاد حقیقتوں کے طور پر تصور کیا جاتا ہے اور افعال و اعمال کو بھی اسی نسبت سے دنیاوی عمل اور دینوی عمل یا معاملہ کہا جاتا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ مومن کی دنیا دین سے الگ نہیں ہوتی۔ جیسا کہ حضرت غوث پاک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ ’’دنیا کو دل سے نکال کر ہاتھ میں لے‘‘۔ پھر دست بہ کار دل بہ

یار ٹھیک ہے۔ یہ مومن کی دنیا ہے ہاں دنیا سے متلازم آخرت ہے اور ہمیں حکم بھی ہے کہ دنیا اور آخرت دونوں میں حسنات طلب کرو، میں حسنات کے ساتھ دنیا اور آخرت دونوں میں آسانیاں بھی طلب کرتا ہوں اے ہمارے رب آسان کر مشکل نہ کر اور خیر سے تمام کر۔ اور دنیا و آخرت میں کامیابیاں عطا فرما۔ آمین۔

مرض اور موت

ایک معالج کی حیثیت سے امراض و اموات کا مشاہدہ میرا روز مرّہ کا معمول ہے اور میں اپنے تجربہ سے اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مرض کا موت سے کوئی تعلق نہیں ہے انسان اگر سو مرتبہ امراض میں مبتلا ہو تو ننا وے مرتبہ صحت مند ہو جاتا ہے۔ صرف ایک مرتبہ مرتا ہے وہ بھی اس مرض سے جسے اللہ تعالیٰ مرض الموت بنا کر نافذ کرے۔ یہاں بھی پہلے حکم مرگ صادر ہوتا ہے پھر مرض کو اس کا سبب بنا دیا جاتا ہے۔ اسی لیئے حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ ''موت زندگی کی ضمانت ہے کہ وقت سے پہلے نہیں آ گے گی''۔ چنانچہ عام بیماریاں جو بظاہر ہماری بد پرہیزی یا بے اعتدالی یا انفیکشن کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں یا تو سزا ہوتی ہیں یا آزمائش یا انعام چنانچہ میں جب بیمار ہوتا ہوں تو کہتا ہوں اے میرے رب اگر یہ بیماری سزا ہے تو معاف فرما، آزمائش ہے تو میں اس کے لائق نہیں اور اگر عطا ہے تو برداشت کی توفیق عطا فرما۔ جیسا کہ حضرت ابراھیمؑ نے فرمایا جب میں بیمار ہوتا ہوں تو میرا رب شفا دیتا ہے۔ چنانچہ مرض اور شفا دونوں اللہ کی طرف سے ہیں۔ البتہ علاج سنت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

دلیل اور عقیدہ

اسلامی تعلیمات کی روح یہ ہے کہ عقیدے کو دلیل سے استحکام دینا چاہیئے

نہ یہ کہ عقیدے کو دلیل کے تابع کر دیا جائے۔ شیطان کے لیئے آخری جواب یہی ہے کہ ''اللہ کو بے دلیل ماننا''۔ عقیدے کو دلیل کے ساتھ چلانا تیزاب سے کھیلنا ہے۔ شیطان مردود ابتداء میں عقیدے کے حق میں دلائل سے مطمئن کر دیتا ہے۔ مگر آخری حربہ کے طور پر ''ردِّ دلیل'' سے حملہ آور ہوتا ہے۔ اس وقت ''دلیل بے دلیلی'' ہی کام آتی ہے۔ جب عقیدہ محکم ہو جاتا ہے تو عشق کا آغاز ہوتا ہے عشق اپنے کمال پر معرفت ہے۔ اور اسی منزل کی یہ خصوصیت ہے کہ:

افلاک سے نالوں کا آتا ہے جواب آخر
اٹھتے ہیں حجاب آخر کرتے ہیں خطاب آخر

جاننا اور ماننا

میرے نزدیک اسلام کی بنیادی روح ماننا ہے، جاننا نہیں یعنی تسلیم ہے تفہیم نہیں ہے بلکہ یوں کہیئے کہ دین ''اسلام'' ہے ''افہام'' نہیں ہے۔ عقیدے کا تعلق قلب سے ہے ذہن سے نہیں ہے اسی لیئے اقرار بالقلب کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ عرفِ عام میں جاننے کا تعلق ذہن سے ہے جو ایک وقوفی عمل ہے جس کی اساس حس یا تمثال ہے۔ جبکہ ماننے کا عمل جذبہ یا ایقان اور وجدان سے متعلق ہے۔ اگر خوش قسمتی سے یہ دونوں عمل ہمرنگ ہو جائیں تو عرفان وجود میں آتا ہے۔ یہ بڑی سعادت ہے۔ عطا ہے، توفیق سے ممکن ہے۔ بزورِ بازو نیست۔ عرفان کی روشنی عشق کے چراغ کی لو سے حاصل ہوتی ہے۔

کچھ آگ دی ہوس میں تو تعمیر عشق کی
جب خاک کر دیا اسے عرفاں بنا دیا

عجز اور کبر

حضرت نظام الدین قادری رحمۃ اللہ علیہ اکثر فرماتے تھے کہ ایک ایسی نیکی ہے جو بندے کے پاس ہے۔ اللہ کے پاس نہیں ہے۔ اس بیان سے مراد ''عجز'' کی اہمیت واضح کرنا تھی۔ عجز اللہ تعالیٰ کی سلبی صفت ہے اس کا نہ ہونا اس میں لازم ہے مگر بندے کے لیئے عجز ہی عبدیت کبریٰ کی راہ فراہم کرتا ہے بندے کا خود کو عاجز جاننا محض ایک حقیقت کا اعتراف ہے یہ کسر نفسی نہیں حقیقت بیانی ہے۔ اس لیئے کہ جو عاجز ہے اسے عاجز جاننا ایک سچائی ہے چنانچہ بندے کے لیئے عجز حق ہے جیسے اللہ کے لیئے کبریائی حق ہے۔ کبر بندے کے لیئے خلاف حقیقت اور ناپسندیدہ ہے پھر یہ کہ عجز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کا اہم ترین پہلو ہے وہ جو دو عالم کا مشکل کشاء اور حاجت روا ہے اپنے لیئے عاجزی اور عبدیت کو معراج جانتا تھا۔

علم و آگہی

علم محض ایک وقوفی عمل نہیں جسے محض آگہی کہتے ہیں۔ بلکہ یہ صفت خداوندی ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو متصف کیا اور فرشتوں کے مقابلے میں اس کو اعزاز قرار دیا۔ سردار الانبیاء حضور اکرام صلی اللہ علیہ وسلم کو علم کا شہر بنایا، سردار الاولیاء مولائے کائنات رضی اللہ عنہ کو اس کا دروازہ قرار دیا گیا اور جملہ مومنین اور مومنات کے لیئے اسے لازم بنایا اور وحی کا آغاز ''اقراء'' سے کیا گیا۔ علم کے وسیع تر مرادی معنوں میں ہنر اور فنون اور ٹیکنولوجی بھی شامل ہے۔ مگر اس کی اصولی تعریف ''حقیقت کی معرفت ہے'' اور اس کا جاننے والا صرف اللہ ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

ایک بڑی نیکی

ویسے تو ہر وہ کام جو اللہ کی خوشنودی کے لیئے کیا جائے نیکی ہے۔ اس نے جو فرائض عائد کیئے ہیں ان پر عمل پیرا ہونا نیکی ہے۔ اس نے جو کام منع فرمائے ہیں ان سے بچنا نیکی ہے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع بلکہ اتباع کی آرزو نیکی ہے۔ مقربین کی تقلید نیکی ہے مگر ایک نیکی جو اللہ کو بہت پسند ہے اور جس کا قرآن حکیم میں بار بار تذکرہ کیا گیا ہے وہ ''بھوکے کو کھانا کھلانا'' ہے میرے دوست فرماتے تھے کہ غریب ہو کہ امیر بھوک کا تشنج سب کے پیٹ میں یکساں ہوتا ہے اس لیئے جو بھی بھوکا ہو اسے کھلاؤ اللہ اس سے خوش ہوگا۔ اس نیکی کے علاوہ ایک اور سب سے بڑی نیکی ہے جو کبھی ''رد'' نہیں ہوتی جو اللہ اور اس کے فرشتے بھی کرتے ہیں اور وہ ہے ''اپنے نبیؐ پر درود'' جس قدر بھی، جہاں بھی اور جب بھی ممکن ہو'' درود'' اور میرے عقیدے کے مطابق ''درود تاج شریف''۔ سبحان اللہ

سچ اور سب

میرے مرحوم دوست سید باسط علی جعفری قادری نے مجھ سے فرمایا کہ ''سچ کہو سب نہ کہو'' اس قول کی معنویت پر جتنا بھی غور کیجیئے رموز کھلتے جاتے ہیں اول تو یہ کہ اس اصول سے کم گوئی صادق آتی ہے۔ غیر ضروری گفتگو سے نجات ملتی ہے پھر یہ کہ انسان کسی گرفت میں نہیں آتا۔ اگر کوئی آپ سے آپ کے مزاج دریافت کرے تو کہیے ''الحمدللہ'' حمد اللہ کے لیئے ہے یہ سچ ہے۔ سچ کہیّے مگر واردات وتوعات و کیفیات کے دفتر نہ کھولدیں اس لیئے کہ سب کہنا مناسب نہیں حالانکہ وہ درست ہی کیوں نہ ہو۔ مگر اس کا کہنا ضروری نہ ہو تو ہرگز نہیں کہیں۔ سرکار غوث پاک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ''کھانا اس وقت جب فاقہ ہو۔ سونا اس وقت جب

نیند کا غلبہ ہو اور بولنا اسوقت جب ضروری ہو' اور ساتھ ہی یہ بھی لازم ہے کہ ہر ایک سے اس کی بساط یعنی ذہنی سطح کے مطابق بات کرو۔ نفوس میں شریعت روحانیوں میں طریقت۔

گناہ اور گنہگار

آدم کی فطرت کا ورثہ گناہ اور توبہ دونوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جبکہ ابلیس کے پاس صرف گناہ ہے توبہ نہیں ہے۔ آدم کی عظمت ہی گناہ کے بعد توبہ سے ہے۔ توبہ کے بعد رحمت ہے۔ سرکارؐ کا فرمان ہے ''اگر مجھے کوئی ایسی بستی نظر آجائے جو نادم گنہگاروں سے خالی ہو تو میں اسے الٹ دوں کہ وہ رحمت سے محروم ہے''۔ اگر اللہ گنہگاروں پر مہربان نہ ہوتا تو انبیاء کیوں آتے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ ہے کہ آپ گناہ سے دور اور گنہگار سے قریب ہیں۔ یہ شانِ رحمت ہے اگر ہادی گنہگار سے دور ہو جائے تو ہدایت کا راستہ بند ہو جاتا ہے۔ میرے مرحوم دوست سید باسط علی جعفری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ''گناہ سے بھاگو گنہگار سے نہیں''

نفی اور اثبات

نفی اور اثبات تصوف کی دو اصطلاحات ہیں جو اپنی معنویت میں محکم منطقی بنیاد کی حامل ہیں۔ کسی بھی شے کے تصور یا تعقل کو بیان کرنے یا سمجھنے کے لیئے اس میں بعض صفات کا ہونا اور بعض کا نہ ہونا تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ ذاتِ باری تعالیٰ کی صفات بھی بعض ایجابی ہیں۔ جن کی اثبات لازم ہے اور بعض سلبی ہیں جن کی نفی لازم ہے۔ مثلاً رحمت اس کی ایجابی صفت ہے اس کی اثبات لازم ہے اور جسامت اس کی سلبی صفت ہے اس کی نفی لازم ہے اسی طرح عبد و معبود کے رشتے

میں بندے کے لیئے عجز کی اثبات اور کبر کی نفی اور معبود کے لیئے کبر کی اثبات اور عجز کی نفی ضروری ہے۔ راہ سلوک میں چلنے اور چلانے والے سالک کی انانیت اور انائی محرکات کی نفی لازم قرار دیتے ہیں۔ معرفت کے لیئے اپنی نفی اور اس کی اثبات لازم ہے۔ اور اس کی شانِ کریمی کا مظہر کامل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے چنانچہ وہاں اثبات اور یہاں نفی ضروری ہے۔ یعنی ''میرا ماہی صلی علیٰ میں کچھ بھی نہیں''۔

دعا

دعا کے معنی چاہنے کے ہیں اور بندے کو مولا کی طرف سے یہ آزادی ہے کہ جو چاہے اپنے رب سے مانگے۔ مگر فقیری سطح پر ایک مسئلہ پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ اس عالم میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اللہ کی مرضی سے ہے تو کیا یہ بندے کو زیب دیتا ہے کہ وہ جو کچھ ہو رہا ہے اس سے مختلف چاہے یعنی اللہ کی مرضی کے خلاف چاہے!
اسی احساس میں مولانا حسرت موہانی نے کہا:

مرضیٔ یار کے خلاف نہ ہو
لوگ میرے لیئے دعا نہ کریں

دوسری طرف یہ کہ دعا مانگنا سنّت ہے اور بعض دعائیں مسنون ہیں بعض آیات قرآنی بھی دعائیہ ہیں۔ تو کیا دعا نہ کریں!

جواب یہ ہے کہ قرآنی دعائیں بندے کی ذاتی چاہت نہیں بلکہ ہدایت ہیں وہ دعائیں مانگنی ضروری ہیں۔ جہاں تک مسنون دعاؤں کا تعلق ہے تو وہ دعائیں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی مانگی ہوئی ہیں اور آپ جو کچھ بولتے تھے، وہ اللہ کی مرضی سے بولتے تھے اس لیئے مسنون دعائیں بھی اللہ کی ہی مرضی سے ہیں۔

البتہ قرآنی مسنون دعاؤں کے علاوہ نجی دعاؤں کی بھی اجازت ہے یعنی یہ کہ بندہ مولا کی مرضی میں راضی رہتے ہوئے اپنی التجائیں بھی اس کے حضور پیش کردے اور اس جذبہ کے ساتھ کہ مولا اگر یہ میرے لیئے بہتر ہیں تو انہیں شرف قبولیت عطا فرما۔ اللہ تعالیٰ خود چاہتا ہے کہ مجھ سے مانگو اور وہ مانگنے والوں سے خوش ہوتا ہے جو دعائیں اس عالم میں پوری نہیں ہوتیں وہ بعد کے لیئے اُٹھا رکھی جاتی ہیں اور ان کا اجر ہے چنانچہ دعا مانگنی چاہیئے مگر افضل یہ ہے کہ قرآنی اور مسنون دعائیں مانگی جائیں اور نجی دعائیں بھی کی جائیں۔ مگر ان پر اڑنا نہیں چاہیئے۔ اس لیئے کہ بندے کی معراج اس کی رضا میں راضی ہونا ہے۔ اگر دعا قبول ہوجائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بھی اس کی ہی مرضی تھی جو اس نے بندے کی زبان سے کہلوا کے پوری کی ورنہ خلاف مرضی یار ہماری کچھ طلب نہیں۔

نظام عالم

قرآن حکیم میں جگہ جگہ آسمانوں کا، زمین کا، دن کا، رات کا، چاند سورج کا، اجرامِ فلکی کا، بارش کا اور ہواؤں میں اڑنے والے پرندوں کا، چلنے والے جانوروں کا، اور تیرنے والی کشتیوں کا تذکرہ ہے اور پھر یہ دعویٰ ہے کہ یہ نظام زبردست حکمت والے نے ایک خاص تخمینے سے بنایا ہے۔ یعنی عالم ظاہر کے تمام نظام ایک مقررہ فطرت پر قائم کردیئے گئے ہیں جو ''افعالِ الٰہی'' ہیں اور ایک عمومیت کے ساتھ چلتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی وقوعات افعالِ الٰہی کے تقاضوں کے خلاف بھی ہوجاتے ہیں یعنی آگ جلاتی نہیں ہے...... چُھری کاٹتی نہیں ہے...... پانی ڈبوتا نہیں ہے...... ہوا پر تخت اڑتا ہے...... دریا میں خشک راستہ فراہم ہوتا ہے...... مچھلی کے پیٹ سے انسان زندہ نکل آتا ہے...... بغیر باپ کے بیٹا پیدا ہوتا

ہے......اور عبد اپنے معبود کے پاس عرش پر جا کر لمحہ کے اندر واپس آ جاتا ہے۔ یہ فطرت کی مستثنیات ہیں۔ یعنی یہاں ''امر الٰہی''، فعل الٰہی پر غالب رہتا ہے۔ اور ذات باری تعالیٰ اپنے امر پر بھی غالب ہے۔ یہی ''کن'' کی شرح یعنی ''فیکن'' ہے جس پر اللہ کی ذات غالب ہے۔ غلطی وہیں ہوتی ہے جہاں ''امر'' افعال کے تابع سمجھا جاتا ہے۔ یہی غلطی شیطان سے ہوئی اور بہت سے ''خردمند'' اور منطقی لوگ اسی غلطی کا شکار ہو کر گمراہ ہو جاتے ہیں کہ وہ ''اوامر کو افعال'' سے مطابقت دیتے ہیں۔ یعنی امر کو فعل کے مطابق دیکھنا چاہتے ہیں اور معجزات و کرامات کے منکر ہو جاتے ہیں۔ امر کو معمول کے پیمانے پر ناپنا شیطانیت اور موجب مردودیت ہے۔ اسی ''امر'' سے انبیاء اور اولیاء کو جو حصّہ دیا جاتا ہے اس سے ہی معجزے اور کرامات ظہور پذیر ہوتے ہیں اور اسی امر والے کی اطاعت کا حکم اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے ساتھ ہے۔

وحدت و کثرت

وحدت کے معنی ایک ہونے کے ہیں اور کثرت کے معنی ایک سے زیادہ ہونے کے ہیں۔ وحدت خالق کے لیئے ہے اور کثرت مخلوق کے لیئے، کہ اُسے ''جوڑوں میں پیدا کیا گیا'' اللہ نے وحدت اپنے لیئے مخصوص کی اور کثرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کر دی ارشاد ہوا کہ ''ہم نے آپ کو کوثر عطا کیا'' یعنی وحدت کے علاوہ جو کچھ ہے وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیئے ہے۔ جب بندہ اللہ سے واصل ہوتا ہے تو کبھی وحدت میں کثرت کا اور کبھی کثرت میں وحدت کا گمان ہوتا ہے۔ وحدت کی شان یہ ہے کہ:

امتیازِ طالب و مطلوب مشکل ہوگیا
قطرہ دریا بن گیا دریا میں شامل ہوگیا

اور کثرت کی شان یہ ہے کہ:

کسی نے کہا عرش اعظم پہ ہے وہ
کسی نے مدینے کی گلیوں میں دیکھا

روزہ، نماز اور خدا

ایک صاحب نے فرمایا کہ میں روزے نماز کو فرض نہیں مانتا اور خدا پر ایمان نہیں رکھتا۔ مگر بحمد للہ پکا مسلمان ہوں اس لیئے کہ صوم وصلوٰۃ کا پابند ہوں اور اللہ پر ایمان رکھتا ہوں۔ بات صاف ہے کہ قرآن کریم کی اصطلاحات کو چھوڑ کر کسی دوسری زبان کی اصطلاحات کو عقیدے کی بنیاد نہیں بنانا چاہیئے۔ ہم اللہ کے بندے ہیں ''خود آنے والے کا تصور درست نہیں ہے''۔

آپ ''یا اللہ'' ایک تسبیح پڑھیئے ثواب ہوگا ''او گاڈ'' پڑھنے کا کوئی ثواب نہیں۔ جب فائق کا نام ہر زبان میں فائق ہے تو اللہ کا نام فارسی میں خدا کیوں؟ یہ برصغیر پر فارسی کے غلبہ کا نتیجہ ہے کہ نماز، روزہ، سی پارہ، گناہ، پاکی ناپاکی جیسے ہزاروں الفاظ رائج ہو گئے۔ اور ہم اصطلاحات کے ترجمہ میں کھو کر اصل کو بھول گئے۔ ہندوستان میں تو خدا حافظ عام تھا مگر تشکیلِ پاکستان کے بعد بحمد للہ ''اللہ حافظ'' کہا جانے لگا۔ وہاں تو السّلام علیکم کی جگہ بھی آداب عرض تھا شاید یہ غیر مسلم اکثریت سے تخاطب کا انداز ہو۔ اسی طرح ہندوستان کا ''بارہ وفات'' بھی پاکستان میں ''عید میلاد'' ہوا ہے۔ بحمد للہ

نفسیاتی نشوونما کے مختلف مدارج میں

اسلامی آداب و معمولات

اگر ہم اپنا دینی اور ثقافتی ورثہ اپنی اولاد کو منتقل کرنے میں ناکام رہے تو یہ مجرمانہ غفلت ہوگی!

افسوس

ہمیں جو یاد رکھنا چاہیے اسے ہم بھولتے جارہے ہیں

سوچیئے

کیا ہمارے عقیدے ہمارے دل کی گہرائیوں میں اتر گئے ہیں کیا ہمارے اعمال ہمارے عقیدے سے مطابقت رکھتے ہیں کیا ہم اپنی صحت مند روایات کو دورِ جدید کی یلغار سے بچا سکتے ہیں

ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے کتاب ھذا کا مطالعہ کیجیے

خود بھی پڑھیئے۔ دوسروں کو بھی تجویز کیجیے اگر مالی حالات اجازت دیں تو چند کتب خرید کر بطور کارِ ثواب اپنے احباب و اعزاء میں بھی تقسیم کر دیجیے

اس مقصد کے لیے یہ کتاب آپ کو نصف قیمت پر فراہم کی جائے گی

رابطہ

شکیب پبلیکیشنز، کراچی

سی ۸/۱۱ گلبرگ، فیڈرل بی ایریا۔ کراچی

فون ۳۶۳۶۷۴۴۰۔۳۶۳۶۵۲۵۵

ڈاکٹر فائق ہومیو ڈکشنری

☆ گزشتہ ڈھائی سو سال میں پہلی کوشش

☆ دنیا کی پہلی ہومیوپیتھک ڈکشنری

☆ ۴۰۰۰ سے زائد اصطلاحات کا ترجمہ اور تشریح

☆ انگریزی سے اردو

☆ بڑے مصنفین کو ان کی ہومیو کتب پر تعارفی تبصرے

☆ ڈی۔ایچ۔ایم۔ایس۔کی نصابی دواؤں کا تعارف

☆ اعلیٰ طباعت۔عمدہ کاغذ۔دیدہ زیب سرورق

☆ ہومیو معالجین۔طلبہ اور اساتذہ کے لیئے

رعایتی قیمت۔/۲۵۰ روپیہ

ہومیو پبلی کیشنز، ۵ سی، ا۔بی، کنیز اسکوائر،

ناظم آباد۔کراچی

فون: 021-36681213
021-36614030

Designed & Produced by: **Al Hadi Graphics** Cell: 0300-2728316